دو مختصر ناول
بیرشیبا کی ایک لڑکی
ماں بیٹی
حسن منظر

دو مختصر ناول

بیرشیبا کی ایک لڑکی

ماں بیٹی

حسن منظر

Birshiba ki aik larki
aur Maa Beti
(Short Novels)

اشاعت: ۲۰۱۰ء

کمپوزنگ: احمد گرافکس، کراچی

طباعت: اے جی پرنٹرز، کراچی

ناشر

بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔

info@scheherzade.com

انتساب

محمد عمر میمن
(پروفیسر، نقاد اور افسانہ نگار)
کے لیے

دو مختصر ناول

بیرشیبا کی ایک لڑکی

(۱)

اس کی عمر کیا ہوگی؟ یہی پینتالیس چھیالیس۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے جب، یا اس سے کچھ پہلے عورتیں خود کو اچانک بوڑھی لگنے لگتی ہیں۔ پہلی بار جب یہ خیال ان کے دماغ میں آتا ہے، بالعموم آئینے کے سامنے، وہ سر کو ایسا جھٹکا دیتی ہیں جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو، تاکہ وہ اس خیال کو جھٹک کر ذہن سے نکال دیں۔ پھر وہ وقت بے وقت آئینہ دیکھنے سے کترانے لگتی ہیں اور یہ کام بس گھر سے باہر نکلتے وقت ہوتا ہے۔ تھوڑی سی پریکٹس سے تمام عقل مند عورتیں خود میں یہ گُن پیدا کر لیتی ہیں کہ اپنے ہر گزرتے ہوئے سال کو وہ اس لاتعلقی سے دیکھ سکیں جیسے سڑک کے کنارے لگے ہوئے سنگ ہائے میل کو جو ویرانے میں سے اُبھر اُبھر کر سامنے آتے ہیں اور آنے والے شہر کا پتہ دیتے جاتے ہیں، ۴۰، ۳۹، ۳۷، ۳۶ کہ اب منزل اتنے میل رہ گئی ہے، اب اتنے، یہاں تک کہ شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ ربیکا کو نہ سنگ ہائے میل کے ایک طرف لکھے ہندسوں میں دلچسپی رہی تھی نہ دوسری طرف، کہ کتنے میل نکل آئے اور اندازاً کتنے میل رہ گئے۔ منزل سے نزدیک ہوتے جانا یا دور، اس کے لیے یکساں اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ کہاں سے چلی تھی، کہاں تک پہنچی تھی یہ وہ سوال نہیں تھے جن کے بارے میں وہ اُن دنوں سوچ رہی تھی جب آٹھ سال بعد میری اس سے اچانک مڈبھیڑ ہوئی تھی۔

اُن دنوں لگتا تھا بیوی سے میری علیحدگی کی نوبت آ گئی ہے اور اپنے مسائل سے بھاگ کر میں اسرائیل دو، تین دن پہلے اڑ کر پہنچا تھا، حالاں کہ پانی کا سفر بہتر رہتا، بحیرہ روم اپنی

لبنان میں میرے تھکے ہوئے دماغ کو جس طرح تھپکیاں دے کر سلا دیتا وہ کام ہوا میں گزارے ہوئے چند گھنٹے کیسے کر سکتے تھے۔ حقیقت میں میرا ارادہ مالٹا، ترکی، لبنان اور اسرائیل جانے کا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے اسرائیل کے سفر سے میری کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ ہوں گی۔ وہاں کی زندگی کی ہمہ ہمی میرے ذہن میں مچی ہوئی قیامت کو بے دم کر سکتی تھی۔ آخر کو وہ آتش فشاں کے دہانے پر بسا ہوا ملک ہے۔ میں وہاں ہوتا تو اسی سوچ میں رہتا ناحق یہاں آیا، نہ جانے میرے قیام کے دوران ہی یہ آتش فشاں ہزارویں بار پھٹ پڑے اور اپنے گھر کے بارے میں بھول جاتا۔

محبت کی شادی کا ٹوٹنا یا اس میں ٹوٹنے کی نوبت آ جانا بڑا مہلک سودا ہوتا ہے۔ میں نزع کی سی کیفیت میں تھا۔ سکون کے لیے وہاں جانے کی میری اپنی دلیلیں تھیں۔ ان میں سے ایک تو وہی تھی جو اوپر بیان کر آیا ہوں کہ جو دہشت اور کشاکش وہاں کی فضا میں تھی وہ شاید میرے اعصاب کو سُن کر دے گی۔ یعنی ایک طرح کی سر پر پیچھے سے ضرب جیسی میں نے کالج کے زمانے میں دیکھی تھی جب مینڈک کو ایک ہاتھ میں پکڑ کر، لیب بوائے (lab boy) دوسرے سے پھرتی سے لکڑی کا چوکور ٹکڑا اتنی طاقت سے اس کے سر پر مارتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے۔ مینڈک کے بعد کے حشر سے گزرنے کا میرا ارادہ نہیں تھا جب اس کے سر کے پیچھے ایک لوہے کی تیلی بھونک کر مغز کو حرام مغز سے منقطع کر دیا جاتا ہے۔ نہیں مجھے اپنا وہ حشر نہیں چاہیے تھا۔ اسرائیل کے شدید خوف کی فضا میں چند دن کے لیے اپنے ذہن اور اعصاب کے ماؤف ہو جانے کی توقع لے کر میں وہاں گیا تھا کیونکہ تمام ہپنوٹکس (hypnotics) مجھ پر بے اثر ہو چکے تھے۔ برطانیہ سے اسرائیل کے لیے روانہ ہوتے وقت مجھے ایک توقع یہ بھی تھی کہ میری بیوی مجھے ایسی جگہ جانے سے روکے گی جہاں ہر لمحے جنگی ہوائی جہاز ہوا میں بلند ہوتے اور لینڈ کرتے ہیں اور جس کے کسی نہ کسی کوچے میں آئے دن بم پھٹتے رہتے ہیں۔ اُسے سنانے کے لیے میں نے اپنے سفر کے ارادے کا ذکر بچوں سے کئی بار کیا مگر اس پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ جتنی گہری وہ محبت تھی جو ہمیں ایک دوسرے کے نزدیک لائی تھی اس نے اتنی ہی گہری لاتعلقی ہم

میں پیدا کردی تھی۔ میں یہ نہیں کہوں گا اتنی ہی گہری نفرت کیونکہ نفرت صرف اس وقت پیدا ہوسکتی تھی جب ہمیں ایک دوسرے کے پاس دوسروں کے ہاتھوں نے پہنچایا ہوتا اور ہم نے ایک دوسرے کو بے عذر قبول کرلیا ہوتا جیسا کہ دوسروں کی مرضی سے ہونے والی شادی میں ہوتا ہے۔ ایک اور صورت نفرت کی ہوسکتی ہے..... جنسی اعتبار کا ختم ہوجانا۔ ہمارے پاس علیحدگی کے لیے وہ عذر بھی نہیں تھا ورنہ میری تھیورم ہے کہ جتنے زور کی محبت ہوتی ہے، ناکام ہونے پر اتنی ہی گہری نفرت اس سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسے تیسری تھیورم :اگر دو سیدھی لائنیں ایک دوسرے کو قطع کریں تو آمنے سامنے کے مخالف زاویے ایک دوسرے کے برابر ہوتے ہیں۔

لیکن مجھے وہاں ریفکے Rivke کے اچانک مل جانے کی توقع نہیں تھی۔ یہ وہ نام تھا جو ملاقات کے چند ہی منٹ کی گفتگو کے بعد اس نے ہنستے ہوئے بتایا وہ خود کو دے چکے تھی۔ جیسے اپنی ایک شرارت کا اقرار کررہی ہو۔

''خیر تم چاہے ربیکا کہو، چاہے ریفکے مجھے کسی پر اعتراض نہیں ہے۔''

میں نے سوچا شاید ریفکے اپنے اندر جاگے ہوئے مذہب پر اس کی فدائت کا پتہ دیتا ہے۔ ایک طرح کی عقیدت۔ جن دنوں ہمارا ساتھ رہا تھا وہ مذہبی عورت نہیں تھی۔ اس کی ماں کا نام، جسے میں نے نہیں دیکھا تھا، ریچل Rachel تھا..... ایک یہودی نام۔

''نیا نام اپنا لینے کے بعد میں مصر رہی کہ میرا یہی نام لیا جائے، بس تھوڑے عرصے تک، پھر ریفکے نے اپنی نویتا کھودی اور مجھے پتہ چلا کہ اس سے میری زندگی میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی ہے۔''

یہ میرا بھی اپنے طرف کے لوگوں کا تجربہ تھا جو خود کو یا اپنے بچوں کو ایک نیا نام دے لیتے ہیں، خواہ وہ ان کے مذہب اور ان کی تہذیب سے باہر کا ہو، اس پر کچھ عرصہ خوش رہتے ہیں اور جب وہ نام لوگوں میں پھیلنے لگتا ہے تو اس سے اکتا جاتے ہیں۔ کتنوں ہی نے ٹولسٹوئے کی ''جنگ اور امن'' کا فلم ورشن دیکھ کر اپنی بچیوں کا نام..... خیر اسے جانے دیجئے۔ ربیکا اپنے نام کے معنی جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی ریفکے اس کی پیار کی بگڑی ہوئی یدش

yiddish شکل ہے۔ ہم پہلے اسے ریب کہتے تھے۔

جب میں نے اسرائیل کی سیاحت کا ارادہ کیا، دل میں بھی اور قدرے بآواز بلند بھی تاکہ دوسرے بھی سُن لیں تو میرے ذہن میں ربیکا بھی تھی اور دو ایک اور اس کے ہم مذہب بھی جو مختلف ملکوں میں میرے رفیق کار رہے تھا یا پڑوسی، یا جن کے ساتھ میں نے ٹینس کھیلی تھی۔ اور اگر یہ درست ہے کہ اسرائیل کا ارادہ کرنے کے بعد یہودی ہونے کی وجہ سے ربیکا میرے ذہن میں آئی تھی تو یہ بھی درست ہے کہ اس کے ہماری دوست ہونے کی وجہ سے تھوڑے سے سکون کے لیے اسرائیل میرے ذہن میں آیا ہوگا۔ یعنی ہوسکتا ہے چلتے پھرتے ربیکا کا خیال ذہن میں آیا ہو اور جواب میں دل نے کہا ہو کہ چلو اس کے روحانی ملک چلتے ہیں۔ آخر کو ایک زمانے میں وہ مجھ سے اور میری بیوی اور بچوں سے بہت نزدیک رہی تھی۔ میری بیٹی کو، مغربی افریقہ کے جنگل میں آباد ایک چھوٹے سے شہر اوکینا میں جہاں بجلی بھی نہیں تھی نہ ہی پائپ کا پانی، گھر پر پیدا کروانے میں اس نے اور ایک کیتھولک سسٹر نرس نے میرا ہاتھ بٹایا تھا۔ پھر جب تک ہماری خط و کتابت رہی وہ دونوں بچوں کے بارے میں ضرور پوچھتی تھی۔ یہ جب کا ذکر ہے جب میرا لیگوس ٹرانسفر ہوگیا تھا اور وہ وہیں افریقی جنگل میں رہ گئی تھی۔ جب ہم برطانیہ چلے گئے اور وہ ہالینڈ تب بھی۔ وہ میرے بیٹے کی بڑی شیدائی تھی۔ دوسری لڑکی کے برطانیہ میں پیدا ہونے پر اس نے اُسے اُونی سوٹ بھیجا تھا اور دوسرے تحائف کے ساتھ میرے لیے ہوانا (سگار) کا ایک پیکٹ۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیلی جنگ کے بعد بھی ہم نے اس میں محبت کی کمی محسوس نہیں کی۔

لیکن میری اونچی آواز میں کہی ہوئی بات کا کہ "بیت المقدس دیکھنے کی عرصہ سے آرزو تھی اب وہاں جا رہا ہوں" کا بیوی پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ لگتا تھا رات کو کار کے شیشوں پر پڑنے والی برف کی طرح ہمارے سرد ہوجانے والے جذبات نے اس کے دماغ کے شیشے پر بھی برف کی تہہ جما دی تھی جو اب کُھرچی نہیں جاسکتی تھی، اس پر گرم پانی ڈالنا ضروری تھا۔ اور وہ شیشے کو چٹخا بھی سکتا تھا۔ جذبات کا یہ کام میں کرنے جا رہا تھا۔ "اگر وہاں مارا گیا؟" دماغ نے کہا۔ اور

میں نے اس کا جواب دیا'' پھر کبھی غلط فہمی کی برف کی تہہ اس کے دماغ پر نہیں جمے گی۔ اور یہ دونوں کے حق میں اچھا ہوگا۔'' یہ غلط فہمی کسی اور لڑکی یا عورت میں میری دلچسپی کی نہیں تھی، اس لیے اور بھی زیادہ گنجلک تھی۔ وجہ میں نہیں بتاؤں گا۔

میرے دوسرے یہودی ملنے والے خود کو اسرائیلی بتاتے تھے اور اس کے دعوے دار تھے کہ ان کا خون بے میل تھا یعنی نسل کے جاری رکھنے میں ان کے پرکھوں میں سے کہیں کسی نے گڑ بڑ نہیں کی تھی، سب حضرت نوح کی کشتی میں سے اترنے والوں میں سے تھے جو میرا خیال ہے جب کشتی رکی ہوگی کیچڑ میں چھپ چھپ کرتے ہوئے خشکی تک پہنچے ہوں گے۔ یا اگر تاریخ میں تھوڑا نزدیک آ جائیں سب اسی پچھلے ذخیرے سے چلے آ رہے تھے جو نبی اسرائیل کا تھا اور ان میں سے کسی کا ارادہ آنے والی نسل کو بے میل رکھنے کے لیے کسی قسم کی گڑ بڑ کرنے کا نہیں تھا۔ ہاں ربیکا نے گڑ بڑ کی تھی اور ایک بار نہیں کئی بار اور ایک ملک میں نہیں کئی ملکوں میں۔ سو اس کا شجرۂ نسل میں جاننا تھا کوئی خاص درست نہیں رہے گا یعنی بفرض محال اگر پہلے سے درست چلا آ رہا ہے۔

سڑک پر غیر متوقع مڈبھیڑ ہوجانے کے بعد کے فوری Gut morgn اور Vos makhtir? (گڈ مارننگ اور کیسی ہو؟ کیسے ہو؟) سوالوں کے بعد جو اتنی یڈش میں تھے جو میں نے ٹورسٹ گائیڈ کو پڑھ کر سیکھ لی تھی میں نے پوچھا۔

"How is little David?" (چھٹکا ڈیوڈ کیسا ہے؟)

"Gut, a dank. unir?" (ٹھیک ہے، شکریہ، اور تم؟)

''ٹھیک ہوں شکریہ۔''

پھر اس نے میرا تلفظ درست کیا Daw vid (دَوِد)

اور میں نے اس کا تلفظ درست کیا'' داوَد۔'' آخر کو اس نام پر میرا بھی حق تھا۔ ہم دونوں ہنس پڑے۔

''اسکول جاتا ہے؟'' میں نے انسیت سے کہا جو مجھے اس سے اُن دنوں پیدا ہوگئی تھی

جب وہ پیٹ میں تھا اور حالانکہ میں نے اُسے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا، اب تک قائم تھی۔

''ہاں۔''

''یہاں؟''

''نہیں۔'' اس کا سر چند لمحوں کو نیچے جھکا پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے شاید جھوٹی خود اعتمادی سے کہا ''اپنے ملک میں۔''

میں خریداری میں اس کے ساتھ ہولیا اور دونوں ایک دوسرے سے بے تعلق رہنے کے پچھلے چار سال کی زندگی کے موٹے موٹے واقعات کو کریدنے اور بتانے لگے۔ میری فلائٹ اسی شام کے لیے بکڈ اور کنفرمڈ تھی ورنہ ہم زیادہ تفصیل سے ایک دوسرے کی زندگی میں گئے ہوتے، کن کن خوشگوار اور زندگی کو اجیرن کرنے والے تجربوں سے گزرے تھے، اب کس قسم کی کتابیں اور فلمیں پسند کرتے تھے، کتنی مذہبی تبدیلی ہم میں آئی تھی، کتنے نئے گناہ اُس سے سرزد ہوئے تھے یا جن سے وہ بچ نکلی تھی۔ یہ وہ باتیں تھیں جو خطوں میں نہیں کی جاسکتی تھیں اور خاص طور سے اس وقت سے جب اس نے خط و کتابت کا سلسلہ بند کردیا تھا۔ میں یہ ٹوہ بھی لینا چاہتا تھا کہ سیاست کے معاملے میں ابھی تک وہ نہ اِدھر کی ہے نہ اُدھر کی..... جو چیز مجھے اس کی زندگی میں پسند تھی..... یا اس کی زندگی نے کوئی خاص سیاسی زاویہ اپنا لیا تھا۔ مطلب یہ کہ ویت نام کی جنگ میں وہ امریکا کی پے بہ پے شکست پر خوش ہونے والوں میں سے تھی یا ملول ہونے والوں میں سے؟ ☆ڈائن بائن پھو کو دس سال گزر چکے تھے، اور اس پر ہم بات نہیں کرتے تھے۔ جن دنوں وہ مجھے پابندی سے خط لکھا کرتی تھی خط کا کم سے کم چوتھائی حصہ دنیا کے دکھوں سے پُر ہوتا تھا۔ لگتا تھا وہ ان واقعات کو سُن کر، پڑھ کر روئی ہوگی اور خود کو اداسی کا شکار بنالیا ہوگا۔ کہاں کتنے بچے کم خوراکی سے مرے تھے، ان کی شکلیں کیسی ہوگئی تھیں، کہاں ٹرین یا ہوائی حادثے یا جہاز کے ڈوبنے میں کتنی جانیں گئی تھیں، کتنی لڑکیاں مردانہ جبر کی شکار ہوئی تھیں اور ان میں سے کتنیوں نے خودکشی کرلی تھی۔ یہ میں جانتا تھا دنیا کے غم کو اپنا بنالینے سے اُسے مہارت تھی۔

☆ ویت نام میں فرانسیسیوں کی فیصلہ کن شکست

لیکن اپنے خطوں کی طرح اس دن بھی وہ اسرائیل کے آس پاس کے ملکوں کے بارے میں خاموش تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم دونوں سڑک پر تھے کہیں تنہائی میں نہیں جہاں ایسی باتیں کھل کر کی جاسکتی ہیں۔ بڑی وجہ دو شخصوں کا مہذب ہونا تھا جو سیاسی اور مذہبی اختلافات کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ میں بھی کائنات کو مسمار کرنے اور ہسپتالوں، اسکولوں کے اڑائے جانے کے آئے دن کے واقعات کے بارے میں خاموش رہا اور اس نے بھی دھماکوں اور اسرائیلی سپاہیوں پر پتھروں کی بارش اور غلیلوں سے حملوں کے بارے میں زبان نہیں کھولی۔ میں نہیں چاہتا تھا اگر وہ دوبارہ مجھ سے خط و کتابت پر خود کو رضا مند کرلے تو اس میں یہ پڑھنے میں آئے کہ'' تم بلڈوزرں سے بستیوں کو سپاٹ کرنے اور ہیلی کاپٹر گن شپس سے آبادیوں پر فائرنگ کی باتیں کر کے مجھے اداس کر گئے اور اتنا کہ کبھی پہلے نہیں ہوئی تھی۔''

ہاں میں اُسے یہ ضرور بتانا چاہتا تھا کہ کتنی بار میں یہ فیصلہ کرتے کرتے رہ گیا تھا کہ برطانیہ کو خدا حافظ کہوں، جس کا میں شہری تھا جس کے وسائل سلطنت کی طرح سکڑتے چلے جارہے تھے اور جہاں مجھے اپنی کھال کی وجہ سے بارہا بےعزتی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ بھی کہ آسٹریلیا یا کینیڈا میں جا بسنے کا ارادہ میں نے کئی بار کیا تھا مگر ان دو ملکوں میں جو ملکہ عالیہ کے سایۂ عاطفت میں تھے مجھے مناسب پوسٹ نہیں ملی اور اپنے اجداد کے ملک کو لوٹنے پر نہ بیوی تیار تھی نہ بچے۔ سو نہ چاہتے ہوئے بھی میرا کنبہ برطانیہ کی شفقت سے عاری بانہوں میں تھا۔ مگر یہ سب باتیں چند گھنٹوں کی ملاقات میں نہیں سما سکتی تھیں۔

اس لیے میں نے پوچھا'' یہ اپنا ملک کہاں ہے؟''

وہ جیسے اپنے خیالات کی نیند سے چونک پڑی اور پلکوں کو جلدی جلدی جھپکنے کے بعد، جیسے لوگ نیند کو روکنے کے لیے کرتے ہیں۔ بولی☆'' بیرشیبا۔''

میں خاموش رہا اور میری خاموشی نے اُسے اگلی بات کہنے پر مجبور کر دیا۔

'' جہاں کی میں ہوں۔ میں بیرشیبا کی ہوں۔'' اس کے چہرے سے خوشی رخصت ہوگئی۔

☆ فلسطین کی جنوبی نوک کے جنوب کا ویرانہ۔ بیر: کنواں (مونث)

''یعنی تمہارے سترہ پیڑھی پیچھے اجداد شیبا کے کنوئیں کے پاس بسے ہوئے تھے؟''

''تم صحیح کہہ رہے ہو۔''

یعنی وہ اپنی زندگی کی ناؤ کو بالآخر سیاست کی دھارا میں ڈال چکی تھی۔

میں نے خوابیدہ لہجے میں کہا'' واقعی؟ میرا خیال تھا تم پولینڈ کی ہو۔''

اس مرتبہ وہ میری جسارت پر خاموش رہی اور میں نے اس غم نا کی کو جس نے ہم دونوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا توڑنے کے لیے مصنوعی مسخرے پن سے کہا'' سو یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے آج بیرشیبا کی ایک لڑکی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ The girl from beesheeba''

وہ اپنی، پرانی طرح مسکرائی۔

اس میں نیا کیا تھا؟ ہمیشہ کی طرح وہ پسلیوں کے اوپر آگے سے سپاٹ تھی اور اسی طرح پسلیوں کے نیچے پیچھے سے بھی سپاٹ..... بغیر خوشوں، اور ٹہنیوں کے پتوں کے کھجور کے درخت جیسی وہ مجھے ہمیشہ نظر آتی تھی۔ اب اس زمین میں جہاں پہلے اونٹوں کے قافلے چلتے تھے یہ کھجور کے درخت کی تشبیہہ اس پر پہلے سے زیادہ صادق تھی۔

مجھے لگ رہا تھا ایئرپورٹ پر پہنچنے سے پہلے کے چند گھنٹوں کے لیے اس کا مجھے اپنے فلیٹ میں لے جانے کا ارادہ نہیں تھا یعنی اگر اس نے یہاں کوئی فلیٹ لے رکھا تھا۔ کسی بیرشیبا یا ☆تل یا بیت میں اس کا کوئی ایک منزلہ مکان ہوگا اس کا مجھے گمان تک نہیں تھا۔ میرے اکثر ملنے والوں، واقفوں کے جو انسان کی اُس قسم سے تھے جس سے وہ تھی، حیفا یا تل عفیف میں گھر تھے حالانکہ حقیقت، کی دنیا میں وہ سب کے سب Wandering Jews ☆☆ کی مثل تھے .....بھٹکتے ہوئے پودے، جن کی سزا یہی تھی کہ وہ یوم قیامت تک دنیا میں بھٹکتے پھریں گے کیونکہ انہوں نے عیسیٰ بن مریم کی صلیب کو جانے والی راہ چلتے ہوئے بے عزتی کی تھی۔ وہ خود میرے

☆ٹیلہ

☆☆زمین پر رینگنے والی بیل جس کے پتے مٹیالے رنگ کے ہوتی ہیں۔

نزدیک اس ٹیوب ☆روز کی طرح تھی جس کے Bulbs کو شفاف پانی کے پیالے میں لگایا گیا ہو جس کی تلی کی پتھریوں میں اس کی جڑیں پیوست نہیں ہوتی ہیں، وہیں کھلتا ہے وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ بس خوبصورتی کے واسطے۔

وہ میرے تمام سوالات کو جھنکیا دے کر بچتی رہی۔ کرۂ ارض کے اس قطع میں وہ کیا کر رہی تھی، اس کے مشاغل کیا تھے (پہلے وہ ڈاک کے اسٹامپس جمع کیا کرتی تھی۔ مجھے اس کا ہر البم یاد تھا) کہاں رہ رہی تھی یا یہ کہ یہاں اس کا بس عارضی قیام تھا؟ مجھے معلوم تھا یہاں وہ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیلی جنگ سے پہلے بھی ایک بار آ چکی تھی اور یروشلم کے اس حصے میں بھی جھانک چکی تھی جو اُن دنوں اسرائیل کا حصہ نہیں تھا۔ مجھے اس نے وہاں کی تقریباً سب کی سب آؤٹ آف فوکس رنگین تصویریں بھی دکھائی تھیں جو لگتا تھا ہلکے نیلے رنگ کی تغاری میں ڈبو کر نکالی گئی ہیں، کم سے کم نیلا ہی اُن میں حاوی رنگ تھا اور انہیں اس نے مجھے فخر سے دکھایا تھا۔ یروشلم اور اس کا اسرائیلی حصہ۔

یہاں مجھے ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ پردیسی ہے لیکن شروع کے گم کردہ ماضی کو حال سے ملانے کی باتوں کے بعد جن میں اس نے آسیہ میری بیوی، ذون، زلیخا اور زینت کا حال سنا تھا وہ مجھے کھوئی کھوئی لگنے لگی۔ اس کے خیالات اس دم کہیں اور تھے جب اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا ''اس کے بارے میں کچھ سنا؟''

جس کے دماغ میں ایک کہانی خود بخود بنتی ہے اس کا سب سے بڑا راز دار اس کا پڑھنے والا ہوتا ہے۔ سو کیوں نہ پوری بات سناؤں۔ ربیکا کون تھی۔ کہاں سے آئی تھی۔ ہم سے اس کا کیا تعلق تھا۔ یہ سب باتیں سننے والی ہیں۔ تو سنیئے۔

ہم نے ایک جگہ کوفی پینے کے لیے بیٹھ رہے تھے کہ بالآخر اس میں اتنی ہمت آ گئی کہ اس نے اپنے روکے ہوئے جذبات کا گرینیڈ ہماری گفتگو کے درمیان پھٹنے کے لیے پھینکا جسے وہ اب تک اپنے دل میں تھامے رہی تھی۔ میں خاموش رہا اور ان چند لمحوں کے بعد جنہوں نے

☆Tuberose۔

اس کے اعصاب پر مضراب کا کام کیا ہوگا میرے مُنھ سے نکلا ''کس کے بارے میں؟''

''تم جھنکے ڈیو کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور اس کی تعلیم کے، ملنے کے فوراً بعد۔''

''ہاں میں پوچھ رہا تھا اور یہی سب سے من موہنے سوالات ہیں جو ایک بچے کی ماں سے کیے جاسکتے ہیں۔''

اس نے پتھریلی آواز میں کہا ''ایک بچے کے جو بن بلائے آیا ہو۔''

''یہی وجہ ہے جو تم سے اسے گھر چھوڑ کر یہاں آ گئی ہو۔ تم بچے کو بے مرد کرنے والی ماں ہو (castrating-mother)۔ یقین مانو اگر خدا غلطی سے مجھے دوبارہ پیدا کرنے کا ارادہ کرلے تو میں تمہارے رحم سے پیدا ہونا نہیں چاہوں گا یعنی اگر اس معاملے میں وہ مجھے بولنے کا حق دے تو۔''

''نہیں مجھے اس سے پیار ہے۔ شرمندگی بھرا پیار۔ اس کا پیار بے میل ملاوٹ کا پیار ہے، لگتا ہے وہ صرف مجھے خوش رکھنے کے لیے دنیا میں آنا چاہتا تھا ورنہ اس کے یہاں آنے کی کیا غرض تھی۔ میں اس کی آنکھوں میں ایسے پیار کو دیکھ کر شرمندہ ہوجاتی ہوں کہ میں نہیں چاہتی تھی۔''

اس کی آواز ٹوٹ گئی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں بھی خاموش رہا۔

''میں اس کے باپ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔'' اس نے چہرے پر طاقت آجانے کے شائبے سے کہا۔

'' مجھے معلوم ہے۔'' میں نے کہا ''اور مجھے افسوس ہے اتنی بات مجھے پہلے ہی بتا دینی چاہیئے تھی۔''

وہ خاموش رہی، آدھی اپنے خیالوں میں ڈوبی ہوئی، آدھی اس انتظار میں کہ میں اس کے آبنوسی عاشق کے بارے میں کیا کہتا ہوں۔

اس نے اپنے عشق کا ذکر فون پر کیا تھا لیکن اس وقت جب وہ حاملہ ہوچکی تھی اور میں ابھی اسی بڑے شہر میں تھا، برطانیہ نہیں گیا تھا۔ بعض شخصیتیں بچپن ہی سے ایسی ہوتی ہیں کہ زندگی بھر

چوٹوں پہ چوٹیں اور صدموں پہ صدمے اٹھاتی ہیں اور ربیکا انہی میں سے ایک تھی۔ جس ڈاکٹر نے میری جگہ پُر کی تھی، میرے ہی سابقہ مکان میں آ کر ٹھہرا تھا اسی نے ربیکا کے ویران خانے کو آباد کیا تھا۔ لیکن عارضی طور سے۔ اس کے بچے کہیں اور پڑھ رہے تھے اور ان کی ماں ان کے ساتھ تھی۔ اس جنگل میں آباد چھوٹے شہر میں بڑے بچوں کی تعلیم کا انتظام نہیں تھا۔ مجھ سے میرے عہدے کا چارج لیتے وقت ہی اس نے کہہ دیا تھا "میرا یہاں کوئی طویل عرصہ رہنے کا ارادہ نہیں ہے۔ نہ مجھے ہیلتھ سروے وغیرہ کا شوق ہے۔ میرا ارادہ ☆ اورتھوپیڈک سرجن بننے کا ہے۔ کسی بڑے شہر ٹرانسفر کرا لینا میرے لیے دشوار نہیں ہوگا۔ وہاں سرجری کا مزید تجربہ حاصل کرنے کے بعد یو ایس اے یا یو کے چلا جاؤں گا۔ اس کے لیے بھی اسکالرشپ لینا کوئی ناممکن کام نہیں ہے۔"

اور میں جانتا تھا جو وہ کہہ رہا ہے حرفو حرف سچ ہے۔ ترقی کے لیے ہاتھ پیر مارتے ہوئے ملکوں میں اسی طرح ہوتا ہے۔ جو وہاں کے ہیں اور ترقی کے لیے ہاتھ پیر مارتے ہیں ان کے لیے ترقی کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ جو وہاں ملازمت کرنے اور خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لیے باہر سے آئے ہوتے ہیں انہیں اتنی ترقی بھی بہ ہزار دقت ملی ہوتی ہے اور انہیں اتنی ہی پر قانع رہنا پڑتا ہے تا آنکہ ان کے سکھائے ہوئے نوجوان کسی مغربی ملک میں تعلیم حاصل کر کے اپنے ملک واپس آ کر اپنے پڑھانے والوں کو اپنی ماتحتی میں لے لیں۔ مجھے وہ چوبیس پچیس سال کا نوجوان خود اعتمادی سے پُر لگا تھا۔ اب یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ بے ارادہ اس بچے کا باپ بن بیٹھا جس کے بارے میں ربیکا نے مجھے لکھا تھا۔

ایک طرح سے وہ مجھ سے خط میں مشورہ لے رہی تھی۔

جنگل کا وہ قصبہ چھوڑنے کے بعد ہم جس بڑے شہر میں گئے تھے وہ بیک وقت ملک کا صدر مقام بھی تھا اور سب سے بڑی بندرگاہ بھی۔ اور وہاں جانے پر ہم بہت خوش تھے کیونکہ وہاں رہنے کا مطلب تھا بجلی، ٹیلی فون، کچن کے لیے گیس کے سلنڈر، لائبریریاں، سینما ہال، بچوں کے لیے اچھے اسکول، ہسپتال اور سمندر کا کنارہ۔ ربیکا مجھے خط لکھتی رہی کیونکہ میری بیوی

☆ جوڑ اور ہڈیوں کا سرجن

خط لکھنے کی چور ہے۔ اسی سال اس کی چھٹیاں پڑیں اور وہ ہالینڈ چلی گئی۔ واپسی کی صبح میں اور بیوی اُسے لینے ائرپورٹ گئے۔ گھر آتے میں اس نے بتادیا وہ ☆پیوژو ۴۰۳ بک کرا کے بھیج چکی ہے اور آج ہی اسے کسٹم سے نکلوا کر کوئی ڈرائیور کر کے وہ اپنی پوسٹ پر لوٹ جائے گی۔ بعد میں مجھے اکثر خیال آیا اسے وہاں پہنچنے کی اتنی جلدی کیوں تھی، اس کی کئی توجیہات ہوسکتی ہیں۔

میرے دل میں اس کے لیے ہمیشہ ہمدردی رہی تھی اور ہے۔ میرا خیال ہے اس کی بربادی اُسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔

راستے میں، میں اس سے ہنسی مذاق کرتا آیا جو چھوڑے ہوئے قصبے کی تکلیف دہ زندگی پر ایک طرح کی چوٹیں تھیں لیکن بغیر طنز کے۔ خود جتنے عرصہ ہم وہاں رہے تھے خوش تھے اور وہاں کی سادگی کی یاد لے کر اس بڑے شہر میں آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔

''ربیکا وہاں ہالینڈ میں ایئر پورٹ ہے؟''

اس نے سنجیدگی سے کہا'' ☆☆اخی پول دنیا کے سب سے بڑے ہوائی اڈوں میں سے ہے۔''

لیکن آخر میں جب میں نے اس سے کہا'' وہاں بجلی ہے؟'' تو اس نے مجھے ہاتھ سے دُت کیا۔

ناشتے کے بعد اُسے کسٹم آفس چھوڑ کر میں اپنے آفس چلا گیا اور بیوی اپنے آفس۔ تیسرے پہر لوٹا تو پتہ چلا کہ اس نے ہماری غیر موجودگی میں، بالکل گھر کے ایک فرد کی طرح، گھر آ کر کھانا کھایا تھا اور اپنی نئی مضبوط کار میں منزل کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔

اس صبح کے بعد پہلے اس نے خط جلد جلد لکھے جن میں ہمارے واقفوں کا ذکر زیادہ ہوتا تھا اور تھوڑا بہت ڈاکٹر ایڈے یمی کا۔ بعد میں خط طویل وقفوں سے آئے اور ان میں ڈاکٹر

☆ فرانسیسی کار Peugeot 403

☆☆ Schipol

ایڈے یمی کا ذکر ختم ہوگیا۔

پھر ایک دن جب میں اپنی ٹیم کے ہیلتھ اسکاؤٹس کو لیکچر دے رہا تھا اس کا فون آیا کہ
''مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے۔''

میں نے کہا۔''بتاؤ''

''بات طویل ہے۔''

میں نے کہا''میں لیکچر دے رہا ہوں۔کوئی پریشان کن بات ہے؟''

اس نے کہا۔''ہاں''

آدھ گھنٹے کے بعد میں نے اُسے فون کیا تو اس نے کہا''میں حمل سے ہوں۔'' وہ رو دو نہیں رہی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایسے معاشرے میں تھی جہاں شادی سے پہلے جنسی تعلق اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ نہ ہی اگر وہ ہالینڈ میں ہوتی تو وہاں کوئی اس بات پر چونکتا۔

میں نے کہا،''ڈاکٹر ایڈے یمی؟''

اس نے کہا،''ہاں''

''پھر؟''

''وہ اس کی ذمے داری لینے کو تیار نہیں ہے۔''

اسی معاشرے کا ایک ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے میرے مُنھ سے بے ساختہ نکلا''تم نے اس کا سدباب نہیں کیا تھا؟'' میرے ذہن میں اُس کا مذہب تھا جو دنوں کے سدباب کے سوا کسی اور طریقے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔یعنی مہینے کے چند مخصوص دنوں کا انتخاب جو محفوظ ہوتے ہیں۔

اس نے کہا،''تم بھی یہ بات کہتے ہو!'' اور اس کی آواز بھرا گئی''میرا خیال تھا تم جذبات کے طوفان میں ان رکھ رکھاؤ کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے ہوگے۔'' وہ رو رہی تھی اور میں نے اس کی ایک سسکی کو سُنا۔

میں نے کہا۔''سوری ریب''

اس دن کے بعد اس کے کتنے ہی خط آئے اور کتنی ہی بار اس نے فون کیا۔ ایک خط میں اس نے وہ بات لکھی جس نے اس کے دل کو کاٹ کر رکھ دیا ہوگا۔

''ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنے خوش تھے جتنے رومیو اور جیولیٹ رہے ہوں گے۔''

''مجھے ایسا لگتا تھا جیسے اس نے پہلی بار شادی کی ہے اور میری تو خیر تھی ہی پہلی بار۔

شام کو ہم دونوں اس پتلی سڑک پر گھومنے نکل جاتے تھے جس کے دونوں طرف ☆گل مہر کے پیڑ ہیں اور جو دریا کے کنارے تک جاتی ہے۔ کبھی ہم ڈپارٹمنٹ کی کشتی میں دریا کے پار بھی جاتے تھے اور کبھی کبھی کسی بڑے شہر ہفتے بھر کی شاپنگ کے لیے۔ یہ سب باتیں قصبے کے لوگ دیکھتے تھے، اُن سے کوئی پردہ نہیں تھا۔ اس کی اپنی کار خراب تھی تو وہ میری کار ٹورز پر بھی لے جاتا تھا۔ وہ میرے گھر آئے یا میں اس کے گھر جاؤں۔ تمہیں معلوم ہے اس کی فیملی یہاں نہیں ہے۔ وہ متوالا ہو کر مجھ سے ملتا تھا۔

''لیکن جس دن میں نے اسے بتایا'' ٹوورا آج میں تمہیں ایک خوش خبری سناتی ہوں، چھوٹا ☆☆ ٹوورا ایڈے یمی میرے پیٹ میں پل رہا ہے۔'' اس کا مُنھ لٹک گیا اور کافی دیر تک وہ کچھ بولا نہیں۔

میں نے کہا، ''کیا سوچ رہے ہو؟'' اس نے کہا ''میرا خیال تھا تم اس عمر سے نکل چکی ہو۔''

میرا جی کٹ کر رہ گیا۔ تمہیں معلوم ہے میں ۱۹۴۰ء میں چودہ سال کی تھی جب میرے ماں باپ کو گیسٹاپو والے (جرمن خفیہ پولیس) گیس چیمبر میں جھونکنے کے لیے لے گئے تھے۔ اس حساب سے چالیس سال کی ہوں۔ کیسے ''اس عمر'' سے نکل چکی تھی جب تک ایک عورت کو ایک، یا ایک اور بچے کی آس رہتی ہے! اور وہ خود کو کیا سمجھتا ہے، سال بھر کا بچہ؟ جس کی ماں ابھی تک اس کے ☆☆☆☆ ڈائپر بدلتی ہو۔ یہی میں جانتی ہوں کس عمر میں یہاں کے بچے تعلیم شروع کرتے ہیں۔ ہم سے بہت لیٹ۔ کس عمر میں ان کی شادی، پہلی شادی ہوجاتی ہے

☆Gulmohar ☆☆_ Towora Adeyemi ☆☆_ ☆☆☆ کلوٹ، نیاپے۔

اور وہ بچوں کے باپ بننے شروع ہوجاتے ہیں؟ ہم سے بہت پہلے۔ اس کی عمر میری جتنی ہوگی۔"

اس کے بعد کے خط میں اس نے لکھا تھا" ٹوودرا! سوری ڈاکٹر ایڈے یمی مجھ پر زور دیتا رہا ہے کہ" میں بچے کو نکال دوں۔ ابھی چند ہفتوں کا ہے۔ میں چار، چھ ماہ مہینے تک کو بارہا نکال چکا ہوں۔" اور اس کی جسارت سنو مجھ سے کہتا ہے" تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"
جیسے صرف جسمانی تکلیف ہی تکلیف ہوتی ہے۔ جذبات کی تکلیف کوئی تکلیف نہیں ہے۔"

پھر ایک دن ربیکا نے فون پہ بتایا" ڈاکٹر ایڈے یمی نے زاریا کا ٹرانسفر کرالیا ہے۔ مجھے اس بات کی سُن گن ہی نہیں ملی کیونکہ متلی اور الٹی کی وجہ سے میں گھر سے نہیں نکل نہ ٹوز پر گئی۔ ☆ اسٹیورڈ نے بتایا" ڈاکٹر ایڈے یمی نومور ان ڈِس ٹاؤن۔ ہی گوٹوزاریا ہزلوڈز گوٹو بگ سٹی ٹوڈے، ہی نوبی ہیر فور ڈیز۔" میں خاموش رہی تو اس نے سوال کیا۔" ورگڈا ہی نوکم ہیراگین؟"

Dokita Ademi no more in dis town. He go to Zaria. His loads go to big city today. He no be here for four days,_____ Wargida he no come here again?

[ڈاکٹر ایڈیمی اب اس قصبے میں نہیں ہے۔ وہ زاریا گیا، اس کا سامان اس بڑے شہر آج گیا۔ وہ یہاں چار دن سے نہیں ہے۔ مالکن کیا وہ دوبارہ یہاں نہیں آئے گا؟]

" دیر تک وہ میرا جواب سننے کے لیے کھڑا رہا۔ پھر" سوری ورگڈا" کہہ کر باہر چلا گیا۔ (سوری میڈم) اس شام اور اگلی صبح کئی مقامی عورتیں صرف سوری کرنے کے لیے میرے پاس آئیں۔ ان میں سے میں کئی ایک کو جانتی تھی کہ ہر ایک اپنے شوہر کی پانچ چھ بیویوں میں سے ایک تھی۔ سب کی سب کرسچین اور وہ بھی رومن کیتھولک۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا آخر ٹوودرا ڈاکٹر

☆Steward گھر کا نوکر۔

ایڈی مجھے چھوڑ کر کیوں چلا گیا۔نکاح یا بے نکاح ایک عورت اگر مرد اس کا ہاتھ پکڑ لے تو اس کی ہوجاتی ہے۔ بعد میں وہ اس کے باپ کا حساب چکا تا رہے۔اتنی بکریاں یا گائیں اور یہاں تو میں اُسے مفت میں ملی تھی۔ یہ بات ان کی فہم سے اوپر تھی۔

(۲)

میں نے کہنے کی کوشش کی'' ربیکا، سوری، ریفکے ۔تم نے ایک بار اپنے خط میں اس کے ہم وطن پر مانینٹ سیکریٹری ہیلتھ کا ایک جملہ اس کے بارے نقل کیا تھا۔تم اپنے ماں بننے کے کیس کے بارے میں اس سے ملنے گی تھیں اور اس نے ساری باتیں سن کر، جو پہلے تم خط میں بھی اُسے لکھ چکی تھیں، کہا تھا'' اس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی پچھتاوا نہیں ہے، نہ ہی خدا کا خوف۔''

'' یہ بات ڈینئل..... نے کہی تھی، یاد ہے؟'' ربیکا نے اثبات میں سر ہلایا۔

'' اغلب یہ ہے کہ تمہارا خط ملنے پر، جو تم نے رجسٹرڈ میل سے بھیجا تھا، اس نے تم سے محبت کرنے والے ٹووورا ایڈے یمی کو اپنے دفتر میں بلا کر بات کی ہوگی اور چونکہ تمہارے حاملہ ہوجانے کا گورنمنٹ سے تعلق نہیں تھا۔ زمانہ جنگ کا نہیں تھا امن کا تھا۔ اس نے بغیر ڈرے کہہ دیا ہوگا بچہ اس کا نہیں ہے۔ یا ایسی ہی کوئی اور بات۔ میری باتیں تمہیں رحم سے عاری لگ رہی ہوں گی.....سوری۔

پرم سیک نے کہا تھا،'' ڈاکٹر اولا ٹووورا ایڈے یمی کو تم سے ہمدردی ہے۔''

ریفکے نے خشک تھوک کر نگلتے ہوئے کہا،'' پچھتاوا، خدا کا خوف اور ہمدردی کس کام کے ہیں۔ان سے میرا کیا بھلا ہوا ہے۔''

'' واقعی بھلا نہیں ہوا ہے۔'' میرے مُنھ سے اداسی بھرے لہجے میں نکلا'' لیکن تم ماتا بھری ماں ہو اور ایک قابل بھروسہ دوست اور .....''

'' ایک devoted نرس'' اس نے میرا جملہ مکمل کیا اور پژمردگی سے میری آواز میں کہا۔

'' یہ تمہارے الفاظ ہیں۔''

'' میں نے کہا تھا؟'' مجھے امید تھی اس کے جواب کے پیچھے کوئی چھوٹا سا واقعہ چھپا ہوگا

اور اسے سناتے ہوئے وہ اپنے ہیجان کے غرفے سے باہر نکل آئے گی۔

''ہاں تم نے اپنی سالانہ رپورٹ میں میرے کام کے بارے میں لکھا تھا'' اور اس کے ساتھ ہی جو جوت اس کی آنکھوں میں جگی تھی، سوگئی۔

میرے نائیجریا سے یونائیٹڈ کنگ ڈم جانے کے بعد، جن دنوں وہ ہالینڈ میں تھی اور ڈیوڈ پیدا ہو چکا تھا اس میں نجانے کہاں سے یہ امید آ گئی تھی کہ میں اولاٹو وورا ایڈے یمی سے ایک نہ ایک دن وہاں کسی بھی شہر میں راہ چلتے ٹکرا جاؤں گا اور اسے قائل کر سکوں گا کہ چرچ میں حاصل کی ہوئی بیوی کے علاوہ بھی ایک عورت اور ایک بچہ اس کی محبت کے حق دار ہیں۔ اس نے اُن دنوں ہر خط میں لکھا تھا'' میں نے سنا ہے اولا انگلینڈ میں ہے۔ تمہیں کہیں نظر آیا؟''

ڈیوڈ کے پیدا ہونے سے پہلے ایک خط میں اس نے لکھا تھا'' یہاں میری واقفیت ایک بے وقوف بیہودن سے ہوگئی ہے، مجھ سے عمر میں دس سے کم بڑی نہیں ہوگی، ☆ بیچلر سنگل عورت ہے۔ مجھ سے ایک دن کہنے لگی'' بچے کو نکال پھنکواؤ۔ اس کے باپ نے تمہیں دھوکا دیا ہے، اس سے پیچھا چھڑاؤ۔ تم کبھی بھی اس پر بھروسہ نہیں کر سکو گی۔ ایک کالے بچے کے ساتھ تم کیسے رہ سکو گی۔ چاہے نہ پوچھے لیکن ہر ایک دل میں یہی سوال ہوگا یہ کالا بچہ تمہیں کیسے ملا؟''

میں نے ایک اور فلٹر ٹپ کنگ سائز سگریٹ سلگایا، اس کے دو تین کش اطمینان پیدا کرنے کے لیے لیے اور کہا'' آخری بات جو میں نے اس کے بارے میں سنی یہ تھی کہ وہ امریکا اورتھوپیڈک سرجری کی ٹریننگ کے لیے گیا ہوا ہے۔''

اور وقت کے اس نکتے پر اس کی زندگی کا اسٹیج پارٹنر، سب سے اہم کردار، اسٹیج سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ اسٹیج پر ناظرین کے سامنے اکیلی کھڑی رہ گئی تھی۔ حیران پریشان جیسے اپنے مکالمے بھول گئی ہو۔ لوگوں کے سامنے اس کا تاڑ کا سا جسم تھا اور کچھ کچھ نمایاں پیٹ۔ ماسنو پام وائن ٹیپ ☆☆ کرنے والے نے وہاں تاڑی کے جمع ہونے کے لیے ہانڈی لٹکا دی ہو۔ افسوس ناک بات یہ تھی کہ آس پاس کوئی بھی نہیں تھا جو پردہ گرا دیتا اور تیز روشنیوں کی یورش

☆ بیچلر: بن بیاہا اکیلا مرد۔ ☆☆ Tap۔

میں اسے اسٹیج سے خود چل کر جانا پڑا تھا۔

پتہ نہیں کیسے اس نے سمندر کے راستے بھیجنے کے لیے صندوقوں میں اپنا سامان پیک کیا ہوگا، کیسے ملک اور نوکری چھوڑنے کے دوسرے سارے انتظامات کیے ہوں گے۔ وہ پیوژو 403 جو ایک لاکھ میل جنگلوں میں سفر کے کام آتی، سرخ کچی سڑکوں پر چلتی، جن میں بارش سے چھتوں کے ٹین کی طرح آر پار نالیاں اور اٹھانیں بن جاتی ہیں اور گڑھوں سے بھری پکی سڑکوں پر، اور اس کا کچھ بھی نہیں بگڑتا جس لیے ربیکا اسے فرانس سے بک کرا کے لائی تھی وہ سال بھر سے کم ہی میں بک گئی۔ اس کا اُسے کتنا دکھ ہوا ہوگا۔

اولاٹو وورا ایڈے یمی کے وہاں سے چپکے سے رخصت ہوجانے پر جیسے شب خون مار کر چلا گیا ہو اسٹیورڈ کے سوال نے کہ☆ ماسٹر نوکم ہیر اگین؟'' ربیکا کی خودداری کو جگا دیا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا ''میں کوئی گری پڑی عورت نہیں ہوں کہ جہاں وہ جائے میں اس کے پیچھے پیچھے جاؤں اور کہوں مجھے رکھ لو۔''

ایک لحاظ سے اس کی خواہش کہ حمل کے دوران اور وضع حمل کے وقت اس کا عاشق اس کے پاس نگہبان بن کے رہے غلط تھی۔ وہ افریقہ میں جہاں رہ رہی تھی وہاں ایک غیر شادی شدہ لڑکی کے حمل کا رہ جانا ایک عام بات تھی جو نہ اپنے محبت کرنے والے سے اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ اب وہ اس کا خرچہ اٹھائے اور ہمہ وقت اس کے آس پاس رہے۔ نہ لمحے کو بھی وہ حمل کو ساقط کرا دینے کا سوچتی ہے۔ اگر گورنمنٹ ملازم ہوتی ہے تو بارہ ہفتے کی، میٹرنٹی لیو maternity leave لیتی ہے اور ٹرین یا بس کا وارنٹ، ماں باپ کے گھر جا کر بچہ جنتی ہے اور اپنے، اپنے بچے کی زیست کے لیے کام پر واپس آ جاتی ہے۔ قانونی بیوی کو زندگی کے اس انتظام پر نہ شوہر پر غصہ آتا ہے نہ اس کی غیر منکوحہ عورت پر۔ زندگی کا نظام اکثر گھروں میں اسی طور سے چل رہا تھا۔ یہ کرسچن ایمان تھا کہ ایک مرد ایک سے زیادہ شادی نہیں کرسکتا ہے اور یہ وسیع طرز زندگی کہ ایک کیتھولک مرد کے بھی گھر کے اردگرد اس کی آٹھ دس بیویوں کے ☆☆ رومبو ہوں جو اس کے

☆Tap، Master no come here again? [صاحب اب یہاں دوبارہ نہیں آئے گا؟] ☆☆ گول جھونپڑے

لیے کھیتوں میں کام کریں، جلانے کی لکڑیاں کاٹ کر لائیں اور اس کے بچے پالیں۔ اس کے خلاف کلیسہ کے حکم کو کون مانتا۔ مذہب ایسے تمام معاملات میں ہمیشہ سے سمجھوتا کرتا آیا ہے نہ کرے تو اس کے ماننے والوں کے تعداد گھٹتی آ جائے۔

ربیکا کے لیے پرم سیک (Permsec) کے دل میں تھوڑی ہمدردی پیدا ہوئی ہوگی اور زیادہ حیرت بھرا تاسف کہ وہ بغیر شادی کے ماں بن جانے پر اتنی بوکھلا گئی ہے۔ اس کا سفید رنگ اور یہودی ہونا وہاں کے پس منظر میں کتنا غیر اہم تھا۔ لوگ Pagans☆ کو جانتے تھے، مسلمانوں اور عیسائیوں کو لیکن اس لفظ یہودی سے ناواقف تھے۔ پھر سفید ہونے میں کیا انوکھی بات تھی۔ یہاں کتنے ہی تھے جن کی رنگت سوکھے ہوئے پتوں کی طرح پیلی تھی اور سب کو پتہ تھا وہ یہاں کی سیاہ عورت اور کسی غیر ملکی سفید مرد کے ملاپ کا نتیجہ تھے۔ ان پر کسی کو اعتراض نہیں تھا نہ ان کی ماؤں پر جو سفید صاحبوں کے ساتھ سوئی ہوں گی۔

ربیکا کے عاشق کی مجبوری کو بھی اس نے تسلیم کیا ہوگا اور ہوسکتا ہے اسی نے اس کے امریکا جانے کے لیے اسکالرشپ لے کر دیا ہو۔ دونوں ہی، بلکہ تینوں ہی ربیکا کے مطالبے پر ہنستے ہوں گے ''پرم سیک'' ڈاکٹر ایڈے یمی اور مسز ایڈے یمی۔ مسز ایڈے یمی نے کہا ہوگا ''اس سفید عورت کی بے احتیاطی کی سزا میرے شوہر کو کیوں ملے۔'' اس ماحول میں راستے بس دو تھے یا ربیکا ۳ مہینے کی چھٹی لے کر اپنے ملک جائے، بچہ پیدا ہونے پر کام پر لوٹ آئے۔ بچہ کچھ پیلے رنگ کا ہوگا۔ ہوا کرے۔ اُسے پالے، خود کو پالے اور جب اُس کا باپ گھر آئے اس کی سیوا بھی کرے۔ یہ شادی کا ذکر کر کے تو اس نے بے چارے عاشق کو ڈرا دیا ہوگا۔

دوسری راہ وہ تھی جو اس نے اختیار کی۔ سفید صاحبوں کی طرح اپنے ملک کو لوٹ گئی۔

ربیکا نے اپنی اس نئی مشکل کا ذکر مجھ سے اپنے خطوں میں کئی بار کیا تھا، میرا خیال ہے دوسروں سے بھی کیا ہوگا ملنے پر اور خطوں میں کہ اس کے عاشق کی کھوج لگائی جائے جو اپنی سیاہ بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر اس کے خیال میں برطانیہ میں چھپا بیٹھا تھا۔ ہوسکتا ہے امریکا میں بھی

☆اوٹ پٹانگ چیزوں کی پوجا کرنے والے۔ تاریک خیال غیر اہل کتاب۔

ڈھنڈوائی کرائی ہو۔ اُن دنوں اگر ملاقات پر میں نے پوچھا ہوتا کہ اب وہ ایڈے یمی سے چاہتی کیا ہے تو اُسے خود تعجب ہوا ہوتا کہ مسئلے کے اس رُخ کے بارے میں اس نے کوئی واضح خیال تعمیر ہی نہیں کیا تھا۔ کیا وہ اپنے سیاہ عاشق کے ساتھ اس کی دنیا میں رہنے کو تیار تھی؟ کسی بڑے شہر میں نہیں جہاں مغربی دنیا کے جزیرے جگہ جگہ ہوتے ہیں۔ اس مکمل افریقی ماحول میں جہاں ایڈے یمی اور اس کی قربت رہی تھی۔ گول جھونپڑوں کی دنیا جن کے درمیان کہیں ایک بھی بنگلہ نہیں ہوتا ہے۔ یا جیسی دنیا میں وہ کبھی کبھی اُسے اپنے ماں باپ سے ملانے لے جاتا۔ جہاں عورتیں پیٹھوں پر بچوں کو باندھے ہوئی زندگی کے کاروبار میں لگی ہوتیں۔ شام کو آباد تاڑی خانے اور شراب گھر، اور اُن سے اٹھنے والی افریقی ڈھولوں اور گانوں کی صدائیں۔ تیز سُرخ، ہرے نیلے بلاؤز پہنے ناچتے ہوئے مرد، تصویروں والی فراکوں میں لڑکیاں اور عورتیں جن کے سر کٹے ہوئے بالوں کے ڈیزائینوں سے سجے ہوتے ہیں۔ روزانہ کا یام (yam)، کساوا (Cassava) اور سفید بینوں کا کھانا اور کبھی کبھی بیون☆، بُش کاؤ یا گلہری کے گوشت کا مرچوں ٹماٹر اور پام اوئیل کا سُرخ سالن جو چاہے خود نہ کھاؤ لیکن انگاروں پر پکائے ہوئے جنگلی چوہے اور سانپ کی طرح اکثر دیکھنے میں آئے گا۔ وہاں شام کو جھونپڑوں اور کچے پکے مکانوں سے اٹھتا ہوا گاڑھا دھواں ہوگا اور ہر کمپاؤنڈ میں لکڑی کے دو تختوں کی آرام کرسی پر ایک بوڑھا مرد بیٹھا لوہے کا پائپ پی رہا ہوگا جو اس کا سسر بھی ہوسکتا تھا۔

کسی باہر کے ملک سے آکر ایسے کمپاؤنڈ میں دن بھر کو ٹھہرنا کہ تمہاری کار تمہیں شام کو ریسٹ ہاؤس لے جائے گی جہاں ہوسکتا ہے بجلی ہو، پانی کا پائپ اور زنجیر کھینچنے والی کموڈ سیٹ اور بات ہے اور ایسا ماحول کا ہوکر رہنا قطعی دوسری بات۔

یہ بھی ممکن تھا تمہیں کچے پکے مکانوں کے بیچ ایک تاریک کمروں والا کچا بنگلہ ملتا جس سے نہ برٹش حکومت کی شان ہویدا ہوتی نہ یہ پتہ چلتا انیسویں صدی کے دوسرے نصف کی تعمیر ہے یا بیسویں صدی کے پہلے نصف کی۔ ٹھیک ہے ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے ایڈے یمی کا گھر

☆ ایک طرح کا بڑا بند۔

شاید اس ماحول سے مختلف ہوتا اور ہوتا بھی برٹش طرز کا لیکن پھر بھی گھر سے تو باہر نکلنا ہوتا تب اس کی کیا گارنٹی تھی وہ ڈیوڈ کا ہاتھ پکڑے ایک دن ایئر پورٹ پر نظر نہ آتی اور وہاں سے ہالینڈ!

اس کی خواہش اس بچے کی سی تھی جو چاہتا ہے اس کی کتاب کھوجائے تا کہ اُسے پڑھنا نہ پڑے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنا نام اس فہرست میں سننا چاہتا ہے جو پاس ہوکر ایک کلاس آگے چلے جانے والے بچوں کی ہے۔

(۳)

میں اور آسیہ اور ذون جب اس چھوٹے سے جنگل سے گھرے ہوئے شہر میں پہنچے تھے تو ربیکا وہاں پہلے سے کام کررہی تھی۔ میں نے ایک ڈچ ڈاکٹر ری لیو relieve کیا تھا جو ربیکا سے بھی پہلے سے وہاں کام کررہا تھا۔ ربیکا اس کے اور اس کی بیوی کے وہاں ہونے سے بہت خوش تھی۔ اُن تین کے ملنے سے وہاں چھوٹا سا ہالینڈ بن گیا تھا۔ میرے اس ڈاکٹر سے چارج لینے پر وہ خوش نہیں تھی گویا میں نے اُسے بے دخل کیا تھا، حکومت نے نہیں۔ کافی عرصہ تک ہمارے تعلقات رسمی رہے۔ ایک بار اس نے ہمیں کھانے پر بلایا جس میں دو ایک افریقی چیزیں تھیں، کچھ ہالینڈ کی، لیکن زیادہ تر پیکٹ کی۔ چکن سوپ وغیرہ اور اُبلے ہوئے مقامی موٹے چاول۔ اس سے ملتا جلتا کام آسیہ نے کیا...... کچی مونگ پھلی کا سرخ سالن تھا، گھی کے کشمش پڑے ہوئے سلطانہ چاول جو امریکا سے آتے تھے، دو ایک پاکستانی چیزیں اور مکئی کی خمیری روٹی جو اس نے زندگی میں پہلے نہیں کھائی تھی۔ وہ آسیہ کی گرویدہ ہوگئی اور ذون کو ذونچے کہنے لگی یعنی چھوٹا ذون جو اس کے نام کی ڈچ شکل تھی۔ پھر ایک دن ٹوؤ سے واپسی پر وہ اس کے لیے مخمل کا کوالا بیئر لائی اور ایک دن آسیہ سے اجازت لے کر اس نے کینڈی کا پیکٹ ڈون کو دیا جو اس کے گلے کا ہار ہوگیا۔ ڈچ میاں بیوی کے اولاد نہیں تھی۔

کچھ دنوں بعد میری کار خراب ہوگئی اور اینو گو بننے گئی۔ بجائے گورنمنٹ جیپ میں ٹور کرنے کے ایک دن میں نے اس کے ساتھ اس کی کار میں سفر کرنا پسند کیا۔ اور یہی وہ بھی

☆ فلسطین کی جنوبی نوک کے جنوب کا ویرانہ۔ بیر: کنواں (مونث)

چاہتی تھی کیونکہ اُسے معلوم تھا مجھے ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف ہے اور جیپ میں سفر کرنے سے درد بڑھ جاتا ہے۔

ایک رورل ہیلتھ سینٹر جاتے وقت ہم ایک دریا پر رکے تھے جس پر پل نہیں تھا اور ہمیں دوسرے کنارے سے آنے والی فیری کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ دریا کے کنارے کنول کھلے ہوئے تھے۔ میں نے ایک پھول دریا سے کھینچ کر مع پورے ڈنٹھل کے توڑا اور ڈنٹھل میں ناخونوں سے اور انگلیوں سے گنڈیریاں بنانے لگا۔ وہ پانی سے ذرا ہٹ کر کھڑی مجھے دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اور ہنس رہی تھی کہ بچوں کی سی حرکت کررہا ہوں۔ لیکن جب میں نے ڈنٹھل کے دو حصوں میں بٹ جانے پر اُس کے سرے پر گانٹھ لگا کر اس کا ہار بنالیا اور اس کی طرف بڑھایا تو اس نے خوش ہوکر اپنا سر جھکا دیا کہ میں خود ہار اس کے گلے میں پہنا دوں۔ ہار پہن کر اس نے بچی مسرت سے تھنک یو کہا۔ اس وقت وہ ایک کم عمر لڑکی لگ رہی تھی۔

واپسی پر ہم ہلکی پھلکی گفتگو کررہے تھے کیونکہ کام سے متعلق باتیں پچھلے دو دنوں میں ہر وقت ہوتی رہی تھیں۔ اس نے دو فلموں کی کہانیاں مختصر کرکے سنائیں جو اس نے ہالینڈ میں پچھلی دفعہ وہاں جانے پر دیکھی تھیں۔ اس قصبے میں سینما ہال نہیں تھا نہ بجلی کے نہ ہونے سے ہمارے گھروں میں ٹیلی وژن تھے۔ ایک فلم کی کہانی میں نے اسے سنائی، پھر چند کتابوں کا ذکر ہوا۔ اس کے بعد جیسے باتیں کرنے کا ذخیرہ ہمارے درمیان ختم ہوگیا۔ وہ کار چلا رہی تھی۔ میں دونوں طرف کے پیڑوں کو دیکھ رہا تھا جن میں کہیں کہیں کوئی جانور نظر آجاتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ گنگناتی رہی اور جب وہ لے بھی ختم ہوگئی تو میں نے اُکتا کر کہا۔

''ایک لطیفہ سناؤں؟''

اس نے کہا، ''سناؤ''

میں نے کہا، ''گندہ ہے۔''

اس کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا اور اسٹرنگ وھیل پر اس کی گرفت سخت ہوگئی۔ اس کی اُسے مجھ سے توقع نہیں تھی۔ پھر اس نے کہا، ''اُسے آسیہ کو سنا سکتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''اس کا فیصلہ سُن لینے پر تم کرنا۔''

اس نے بے دلی سے کہا۔ ''سناؤ''

میں لطیفہ سنانے لگا جو میں نے اپنے جہاز کے سیکنڈ انجینئر سے سنا تھا اور جو اس طرح تھا۔

''امریکا کے اُجاڑ مغرب میں ایک شراب خانہ ہے جہاں دوائیں بھی فروخت ہوتی ہیں۔ ایک شام جب سب پینے والے جاچکے تھے یا وہاں سے گھوڑا گاڑی پر لاد کر لے جائے جاچکے تھے اور اس کا مالک دکان بند کرنے کو تھا ایک ناٹے قد کا دبلا پتلا مہمان آیا۔ اس نے کاؤنٹر پر ایک ڈالر کا سکہ رکھا اور بولا، ''ایک جرعہ انڈیلو''

مالک مے خانہ بھی ہر ختم ہوجانے والی بوتل کے آخری قطرے شام بھر پی پی کر خود نشے میں تھا اور شاید گھر جا کر بستر پر خود کو گرادینے سے بڑھ کر کوئی اور خواہش اس کے دماغ میں نہیں تھی۔ اس نے پتھر کی بڑی بوتل جھکا کر ایک جرعہ انڈیل کر نئے مہمانوں کو دیا جو اُسے ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا۔ ایسا کرنے میں اس کے سر کو ایک جھٹکا لگا لیکن بولا کچھ نہیں۔ خاموشی سے باہر چلا گیا۔

اتنی دیر میں مے خانے کا مالک وہیں کاؤنٹر پر سر رکھے رکھے اونگھ گیا تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے سر کو ایک جھٹکا لگا کیونکہ بجائے شراب کے اس نے تیزاب کی بوتل سے وہ جرعہ انڈیل کر آخری مہمان کو دیا تھا۔ اب تو کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ اس کا نشہ ہرن ہوگیا۔

ساتھ ساتھ میں اردو محاوروں کا ترجمہ کرتا جارہا تھا۔

اور وہ دیر تک اسی ڈر میں وہیں بیٹھا رہا کہ اب شیریف مع وردی والوں کے مجھے گرفتار کرنے کو آتا ہوگا۔

لیکن جب آدھی رات گزر جانے پر بھی وہاں کوئی وردی والا نہیں آیا تو اس نے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ گیا۔

لیکن وہاں نیند کہاں اس کے نصیب کی تھی۔ انتظار تھا کہ اب دروازے کی گھنٹی بجی اور

اب پولیس آئی۔لیکن اسی اب، اب میں رات گزری، دن گزرا، دوسری شام ہوئی۔لوگ آتے رہے، پی پی کر جاتے رہے۔ان میں لڑائیاں ہوئیں، گلاس ٹوٹے اور جو روز ہوتا تھا ہوا، یہاں تک کہ شراب خانہ اُن سے خالی ہوگیا اور وہ یکا وتنہا وہاں بیٹھا رہ گیا۔اس دن اس نے شراب کا ایک قطرہ بھی مُنھ میں نہیں ٹپکایا تھا۔

اچانک وہی پچھلے دن والا ناٹے قد کا دبلا پتلا مہمان باہر کے اندھیرے میں سے نمودار ہوا۔کاؤنٹر پر اس نے رقم رکھی اور بولا،"ایک جرعہ انڈیل دو" اور جب مالک شراب خانہ شراب انڈیلنے جا ہی رہا تھا تو اس نے کہا"مگر کرم سے اتنی تند نہیں جتنی کل تھی۔خیر اس کے تند ہونے پر مجھے اعتراض نہیں ہے، مشکل یہ ہے ہر بار جب ہوا خارج ہوتی ہے تو پتلون کی رومالی میں سوراخ کر جاتی ہے۔"

ربیکا نے پورا لطیفہ دلچسپی سے سنا تھا۔اختتام پر اس نے قہقہہ لگایا اور بولی۔

"اوہ۔اس طرح کا گندہ۔میں کچھ اور سمجھی تھی۔"

میں نے کہا"تمہارا ذہن گندہ ہے۔آسیہ اسے مہمانوں کے سامنے بارہا سن چکی ہے۔"

اس دن کے بعد سے وہ محض ایک ساتھ کام کرنے والی نرس نہیں رہی، میری دوست بن گئی۔آگے چل کر وہ مجھ سے ہر قسم کی باتیں کرنے لگی جن میں اس کے دکھڑے بھی ہوتے تھے۔

(۴)

ایک شام ربیکا اور میں ایک ریسٹ ہاؤس کے مشرق کی سمت بنے ہوئے برآمدے میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے کہ وہ اچانک ہنس پڑی۔

تھوڑی دیر پہلے ہم اپنے دن بھر کے کام کا جائزہ لے رہے تھے۔میں نے پچھتر کے قریب کوڑھ کے مریض دیکھے تھے، سائیکل پر ایک گاؤں، جہاں کار نہیں جا سکتی تھی، اپنے اسکاؤٹس کے ساتھ گیا تھا جہاں ☆ یوز yaws کے تین نئے مریض دیکھنے میں آئے تھے۔اس

☆ ایک مثلِ (آتشک) جیسا لیکن غیر جنسی مرض۔

علاقے میں پانی کی شدید کمی تھی اور ان کے وہاں ہونے کی مجھے توقع تھی۔ پھر میں نے رورل ہیلتھ سینٹر آ کر عام مریض دیکھے تھے جن میں ایک عورت کے رحم کا کھرچ کھرچاؤ ☆ بھی تھا جس کا خون اسقاط ہونے کے بعد بند ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ شام کو پینتالیس میل کار چلا کر میرا ارادہ گھر لوٹ جانے کا تھا۔ آسیہ ان دنوں حمل سے تھی۔

ربیکا کو گھر پہنچنے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ تین دن سے ٹورَ پر تھی اور مزید کتنے دن ٹورَ پر رہتی اس کا دارومدار اس راشن پر تھا جو وہ اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔

سامنے افق تک پھیلے ہوئے سبز میدان تھے کہیں اونچے، کہیں نیچے۔ جیسے پہاڑیوں پر ہرا قالین بچھا دیا گیا ہو۔ سورج ہماری پشت پر تھا اور سامنے کی پہاڑیاں چاندنی جیسی دھوپ میں نہائی ہوئی تھیں۔ ان کا ہرا رنگ کہیں ہلکا تھا کہیں گہرا، کہیں سیاہی مائل کہیں اُجلا۔

میں نے کہا۔ ''ہنسیں کیوں؟''

بولی۔ ''مجھے ڈاکٹر بھورے یاد آ گئے تھے۔''

''وہ کب تمہاری زندگی میں آئے تھے؟'' میں اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔

''کئی ایک کی طرح آتے آتے رہ گئے۔''

''ڈاکٹر ہینز Heinz اور نورمن Norman کی طرح؟''

''تقریباً'' اس نے کہا۔ ''بے چارہ بیوی کو انڈیا چھوڑ کر آیا تھا۔ اس ملک میں تنہا تھا۔ زاریا کی جس کانفرنس میں تم سے ملاقات ہوئی تھی اور تم نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا ٹرانسفر ہو کر اوکنیا آ رہے ہو اسی میں ڈاکٹر بھورے سے ملاقات ہوئی تھی۔ دوسرے سیشن میں وہ میرے برابر میں آ کر بیٹھا تھا۔ اس نے نہ کوئی پیپر پڑھا تھا نہ بحث میں حصہ لیا تھا۔ بیچ بیچ میں مجھ سے بات کرتا رہا تھا۔ وہاں سے اٹھتے وقت اس نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی تھی بلکہ پروگرام کے مطابق مجھے ہوسٹل سے اپنے گھر لے جانے آیا تھا۔''

میں بھورے کو جانتا تھا۔ مرہٹہ تھا۔ اس کی بیوی کو بھی میں نے دیکھا تھا۔ خوبصورت اور

D & C: dilatation & curretage ☆

عمر میں اس سے کافی چھوٹی۔ بچہ کوئی نہیں تھا۔ ایک ٹوُر کے بعد وہ اسے بھارت چھوڑ آیا تھا۔
ربکا کی بات سنتے ہوئے مجھے خیال آ رہا تھا ایسی بیوی بھی کوئی گھر چھوڑ آنے کی چیز تھی۔

''گھر صاف ستھرا تھا۔ اس نے ہندوستانیت ٹپکتی تھی۔ پردوں پر ہاتھی اور وہ آم کی طرح کی نوک دار پھل کی چھاپ (میں نے کہا انہیں ہم کیری کہتے ہیں) جو صرف تمہارے یہاں کے کپڑوں اور ٹائیوں پر بنی ہوتی ہیں، شیلف پر سر اور دھڑ ہلاتی ہوئی مورتیاں تھیں، پیتل کا ناگ جس کے پھن پر موم بتی تھی، ایک سنگ مرمر کی مورتی جس کے ہاتھ بین پر تھے اور ایک مرد کی مورت جس کے ہاتھ میں فلوٹ (بانسری) تھا۔ ایک اور مورتی بھی تھی جس کا بریزئر brassiere بہت تنگ تھا۔ دیواروں کی ایک تصویر مجھے یاد رہ گئی ہے ایک نیلے رنگ کا موٹا سا لیکن چھوٹے قد کا آدمی اور اس کے آس پاس بیٹھی ہوئی گائیں۔

میں نے کہا، ''لگ رہا ہے دہلی میں بیٹھی ہوں۔''

اس نے کہا، ''مہاراشٹر کے ایک گھر میں۔''

میں نے پوچھا، ''تمہاری بیوی کہاں ہیں؟''

اس نے کہا، ''پونے میں۔''

پھر وہ اپنے البم مجھے دکھانے لگا۔ جب اس کے اسٹیورڈ نے آ کر کہا، ''کھانا لگ گیا ہے'' تو میں نے پوچھا۔ ''باقی مہمان کہاں ہیں۔''

اس نے کہا، ''تم اکیلی مہمان ہو۔ مائی اسپیشل گیسٹ۔''

''کھانا کم مرچوں کا تھا لیکن ہندوستانی اور واقعی صرف دو کے لیے۔ میرا خیال تھا زیادہ مہمان ہوں گے کیونکہ شام کے سیشن کے خاتمے پر اس نے کئی اور کے پاس جا جا کر آنے کا وعدہ لیا تھا۔ کس دن کے لیے اس کا مجھے خیال نہیں آیا تھا۔

برتن اٹھانے اور کوفی سرو ہونے کے بعد..... میں نے کھانے سے پہلے بھی ہر قسم کے ڈرنک کو منع کر دیا تھا اور کھانے کے دوران بھی..... اس نے اسٹیورڈ کو جانے کے لیے کہا..... میرا خیال ہے رات بھر کے لیے۔ میں نے بدتہذیبی سے اسٹیورڈ سے کہا، ''ڈرائیور سے کہو مجھے

ہوسٹل پہنچا آئے۔''

اسٹیورڈ تذبذب میں وہیں کھڑا رہا۔

ڈاکٹر بھورے نے کہا،'' میرا کوئی ڈرائیور نہیں ہے، خود کار ڈرائیو کرتا ہوں'' اور منھ اسٹیورڈ کی طرف پھیرتے ہوئے کہا،'' گڈ ون تم جاؤ آرام کرو۔ میں چھوڑ آؤں گا۔''

جب اسٹیورڈ چلا گیا تو اس نے مجھ سے کہا،'' میری بیوی گھر کا ایک ایک کمرہ ایک ایک کونا سجا کر رکھتی ہے۔ آؤ تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔''

اس دفعہ میں نے اس کی بات بیچ میں نہیں کاٹی صرف اس کے جملے کے خاتمے پر سختی سے کہا۔

''باقی گھر دکھانے کے بعد آخری چیز جو تم مجھے دکھانا چاہو گے وہ تمہارا بیڈ روم ہے۔ شکریہ۔ کیا اسی لیے تم نے اتنی رقم کھانے، ☆گنی فاؤل روسٹ، اسٹیمڈ بیرا کوڈا اور وائٹ وائن پر ضائع کی ہے؟ شکریہ۔ میں واپس جاؤں گی۔ اسٹیورڈ کو کہو گیراج کا دروازہ کھولے اگر وہ تم نے بند نہیں کرادیا ہے۔''

میں خوش تھی ایک اور شخص کو جو کھانے کے بعد مجھے اپنے گھر دکھانا چاہتا ہے میں نے رد کردیا ہے، بادل ناخواستہ وہ اندر کہیں سے کار کی چابی لے کر آیا۔''

''ہا۔ہا۔'' ربیکا زور سے ہنسی۔'' اب راستے بھر اس کہانی پر غور کرتے ہوئے جانا، اور عش عش کرنا کہ ربیب اتنی سادہ لوح نہیں ہے۔''

اس کے دل میں عزت بھری محبت صرف ایک مرد کی تھی جس کے ساتھ اس نے کیمرون میں کام کیا تھا۔ وہ اس کی طرف محبت بھری نظروں سے بڑھا تھا، بانہیں پھیلائے ہوئے نہیں اور اس نے جلد ہی بتادیا تھا شادی شدہ ہے۔ بیوی ڈارون آسٹریلیا میں تھی۔ وہ اس کے متواتر شبہے کے حملوں سے بچنے کے لیے وہاں آ گیا تھا ورنہ وہ بے حد خوب صورت تھی، آرٹسٹ تھی اور کورٹ شپ کے زمانے تک پیرانوئیڈ☆☆ نہیں تھی۔

☆چتکبری مرغی اور ایک سمندر کی مچھلی guinea fowl/ steamed baracudc۔

☆☆ شک کرنے کا مرض یا ذہنی مرضوں میں شک کی علامت۔

''تعجب یہ ہوتا تھا کہ اتنی پوشیدہ لڑکی کیسے اس کی بدنامی کا باعث ہوسکتی تھی۔ ڈاروِن میں عورتیں اس کے زیر علاج آنے سے کترانے لگی تھیں۔ ابھی تک اس کے دل میں وہ لڑکی بسی تھی جس نے شادی سے پہلے اس سے والہانہ محبت کی تھی۔ شادی کے بعد کی عورت کیسی تھی شاید وہ خود ہی اس کا پورٹریٹ بنا سکتی تھی..... سیلف پورٹریٹ۔ شادی کے شروع کے دنوں کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر اس کے کلینک میں کتابوں کی شیلف پر رکھی تھی۔

ٹریجیڈی یہ تھی نہ وہ علاج کے لیے تیار تھی نہ اس میں کوئی ایسی بات تھی جس کے لیے اسے علاج پر مجبور کیا جا سکتا۔ وہ کسی اور کے لیے ایذا کا باعث نہیں تھی۔

نتیجہ: وہ کیمرون آ گیا تھا۔ طلاق نہیں ہوسکتی تھی اور اس کے بغیر وہ مجھ سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا'' مجھے تم سے محبت ہے اور وفادار رہوں گا۔ ہم مرد اور عورت کی طرح زندگی بھر ساتھ رہ سکتے ہیں اور میں وعدہ کرتا ہوں اگر جین پچھتا کر میری زندگی میں دوبارہ آنا چاہے تو بھی تمہارا ہوکر رہوں گا۔ لیکن شادی کے کاغذات نہیں ہوں گے۔''

پھر اس نے گہری سوچ کے ساتھ کہا تھا'' ہمارا کیس ہوپ لیس ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے اپنی زندگی کی راہ پر چلتی رہو۔ ہوسکتا ہے ایک دن صحیح مرد مل جائے، میری طرح عیب دار نہ ہو، جس سے شادی ہوسکتی ہو۔''

"He was a decent person"

ایک شام ہم اسی میل دور کے ایک رورل ہیلتھ سینٹر سے لوٹ رہے تھے۔ میں کار چلا رہا تھا وہ برابر کی سیٹ پر بیٹھی ہلکی پھلکی باتیں کر رہی تھی جیسا کہ اس کا دستور تھا۔ پھر ایک گانا گانے لگی۔ میں اندر سے خوش نہیں تھا۔ پرنسپل میڈیکل آفیسر کا خط اس ناخوشی کی وجہ تھا۔ ایکا ایکی اس کا گانا رک گیا اور تھوڑے تذبذب کے بعد بولی آج مجھے اپنے ماں باپ یاد آ رہے ہیں اور ☆ایڈوپٹو ماں باپ جو......''

اس کے بعد اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ میں خاموشی سے کار چلاتا رہا۔

☆اپنی بیٹی بنالینے والے adoptive parents۔

تھوڑی دیر بعد اس کی آواز واپس آ گئی" پولینڈ میں ایک کرسچین فیملی نے مجھے موت کے منھ میں لے جائے جانے سے بچایا تھا۔ وہ میرے ایڈوپٹو ماں باپ تھے۔ ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ اب مجھے یاد نہیں ہے ہم کیسے ائرپورٹ پر پہنچے تھے مگر وہاں وہ شوہر اور بیوی، میں اور میرے ماں باپ ایک بینچ پر بٹھا دیئے گئے تھے۔ لوگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے مگر ہم سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ کبھی کوئی نازی سولجر اپنا سواستکا جمائے، بندوق سنبھالے اپنے آگے آگے کسی بدنصیب روتی ہوئی یہودی عورت کو لے جا رہا ہوتا تھا کبھی کسی نوجوان یہودی لڑکے کو۔ ان کو دیکھ کر میری ماں بھی اپنا چشمہ اتار کر اپنی آنکھیں خشک کر لیتی تھی۔ ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا ہمیں معلوم نہیں تھا۔ میں اس وقت تک بڑی نہیں ہوئی تھی بس اتنا مجھے یاد ہے۔ ماں باپ کو اپنی اور میری زندگی کے بارے میں مکمل نراشا نہیں تھی۔ لیکن اس کا زیادہ امکان تھا کہ ہمیں ختم کر دیا جائے گا۔ گیس چیمبر یا جو کچھ بھی ان دنوں فاشسٹوں کا رواج ہوگا، جس کا چرچا ہر دم ہمارے لوگوں میں رہتا تھا۔ وہ کرسچین عورت اور مرد ہماری طرح بھوکے تو تھے لیکن اتنے پریشان نہیں تھے۔ شاید وہ ہم تینوں کی گھبراہٹ کو دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ ہم اپنے سر پر موت کو منڈلاتے دیکھ رہے ہیں۔ اپنے بارے میں انہیں یقین تھا کہ معمولی پرسش کے بعد انہیں جانے دیا جائے گا۔

اُس عورت نے دبی زبان میں بغیر پوچھے اپنا اور اپنے شوہر کا نام میری ماں کو بتایا تھا جس میں اس لمحے تک میری ماں کو دلچسپی نہیں تھی۔

عورت نے ہمدردی سے میری ماں سے کہا تھا۔ "تم؟"

اور اس نے سر کی معمولی سی جنبش میں "ہاں" کہا تھا اور ساتھ ہی اپنا نام بتایا تھا..... ریچل، جو بے ضرورت تھا۔ پھر اس عورت نے میرے باپ کا اور میرا نام پوچھا تھا۔ دونوں میں زیرلب یہ تعارفی بات چیت ہو رہی تھی۔ میں خاموش بیٹھی تھی۔ ایک بار میرے باپ نے بھی آہستہ سے "ہاں" کہا تھا۔

اس کے بعد پانچ سیکنڈ سے بھی کم اس عورت کو جسے آگے چل کر میری ماں بننا تھا، اپنے شوہر سے مجھے اپنی تحویل میں لینے کی اجازت لینے میں لگے۔ ایک یہودی لڑکی کو ان حالات میں

خود اپنی ظاہر کرنا ان کے لیے بدترین خطرے کا باعث ہوسکتا تھا اس سے وہ آگاہ تھے۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر میری ماں سے کہا تھا "اسے میں رکھوں گی، میری بیٹی ہے.....سُولا۔ تم تینوں کو آپس میں کوئی مشترک جذبہ ظاہر نہیں کرنا ہے۔ نہ ماں باپ کو بیٹی کے لیے نہ بیٹی کو ماں باپ کے لیے۔

لوگوں کے پاس سے گزرنے کے درمیانی وقفوں میں وہ بغیر ہماری طرف دیکھے ہدایات دے رہی تھی۔ مرد کی آواز موٹی تھی اس لیے وہ خاموش تھا۔ لیکن اس کا سر بیوی کی ہر بات سے متفق ہونے میں برابر ہل رہا تھا۔ نجانے کب میری نئی ماں کے بوسیدہ کارڈیگن سے ایک سنہری زنجیر باہر نکل آئی تھی جس میں سنہری صلیب جھول رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب دو نازی فوجی آئے تو اس غیر مرد نے ایقان کے ساتھ کہا "یہ میری بیوی ہے، یہ ہماری بیٹی سولا۔"

"ہم دونوں شوہر اور بیوی ہیں، میرے ماں باپ نے ایک ساتھ کہا۔

انہوں نے انہیں اٹھ کھڑے ہونے کے لیے کہا اور ساتھ ہی اپنے پیچھے آنے کو۔ دونوں گہری سانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ غیر عورت میرا ہاتھ تھامے رہی اور اس کا شوہر کا ہاتھ خود اس کے دور کے کندھے پر تھا۔ میں نے اپنے پنجے اور ایڑیاں جیسے کنکریٹ کے فرش میں دھنسا رکھے تھے اور میرے جبڑے اتنی سختی سے بند تھے کہ ان میں درد ہونے لگا۔ پھر بھی میں اس صدمے سے اندر ہی اندر ہل رہی تھی اور میری آنکھیں خشک تھیں۔

میرے ماں، باپ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے مجھ سے دور ہوتے گئے لیکن انہوں نے میرے لیے جو سب سے بڑی قربانی دی وہ یہ تھی کہ ایک بار بھی پلٹ کر انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔

اس دن کے بعد سے مجھے بارہا خیال آیا، شروع کے دنوں میں کئی کئی بار، کہ ان دونوں نے میرے ماں باپ کے لیے بھی کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ میرا بھائی ہے یہ اس کی بیوی یا ایسی ہی کوئی اور بات۔ اگر چاہتے تو انہیں بھی بچا سکتے تھے اور مجھے جن دنوں میں ان کے ساتھ رہ رہی تھی اکثر ان پر غصہ آیا کہ انہیں اپنی جان پیاری تھی، میرے ماں باپ کی نہیں۔ قیامت کی

گھڑے گزر جانے کے بعد فوراً ہی بعد میں احسان فراموش بن گئی تھی۔''

اس کی بات ختم ہو چکی تھی۔ راستہ بھی ختم پر تھا۔ دور سامنے جہاں روشنیاں نظر آ رہی تھیں اُکنیا تھا۔ میں چپ رہا۔

''میرے adoptive parents کی میرے اعتقاد کے بارے میں کوئی رائے نہیں تھی۔ نہ اِس سرے نہ اُس سرے۔ خود ان کے مذہب کے بارے میں جو چیز میرے اندر سرائیت کرتی جا رہی ہوگی وہ ان کا کرسچین برتاؤ تھا۔ گھر میں اور گھر کے باہر..... اور میں خود کو بتاتی رہتی تھی یہ چیز ہمارے یہاں یوں نہیں ہے، یوں ہے۔ یا ہم یوں نہیں ہیں یوں ہیں۔ بالخصوص ان کا خون کی continuity (تسلسل) کے بارے میں فکر نہ کرنا۔ ان کی ایک بیٹی نے کسی پروٹسٹنٹ کرسچین سے شادی کی تھی اور اسپین میں تھی۔ وہ خود کیتھولک تھے۔ میں خون کی continuity کی فکر کرتی تھی کہ خون ملنا نہیں چاہیئے، ہمیشہ ایک ہی رہنا چاہیئے پشتہا پشت۔''

''نہ اس میں منگول خون ملے، نہ نیگرو، نہ ایرین (وہ ہنس پڑی) نہ مسلم، نہ کرسچین، نہ ہندو نہ بدھسٹ۔''

''ہاں لیکن توریت سے زیادہ میں اپنے مذہب کے بارے میں نہیں جانتی تھی اور اس سے زیادہ جنگ کے بعد ہمارے لوگوں میں سے وہاں کوئی اس کا جاننے والا نہیں رہا تھا۔ انہوں نے کبھی مجھ سے یہ تک نہیں پوچھا ''تم رات کو سونے سے پہلے کبھی دعا مانگتی ہو؟ اور مانگتی ہو تو کیا؟''

''ایک دن میں ان کے ساتھ چرچ صبح کی سروس میں بھی گئی تھی۔ وہ میری پرورش اُس محدود غذا پر جو جنگ کے زمانے میں میسر تھی اپنی بیٹی کی طرح کر رہے تھے۔ میں نے کبھی پلٹ کر بھی نہیں پوچھا پلیٹ میں جو گوشت میرے سامنے ہے ☆کوشیر ہے یا نون کوشیر۔ کبھی کبھی میں خود بھی سوئر کی تلی یا جگر کا اسٹیوسب کے لیے پکانے لگی تھی جسے امن کے دنوں میں کوئی

☆یہودی قانون کے مطابق کھانا kosher۔

یہودی منہ نہیں لگاتا۔ پھر بھی یہ ایک عارضی بندوبست تھا۔شکر ہے میرے ماں باپ کو نہ بچانے کا غصہ میں نے ان پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا ورنہ مجھے گھر سے تو نہیں نکالتے پاگل ضرور سمجھنے لگتے۔

''جنگ کے خاتمے کے بعد سے میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوں یکا وتنہا۔جس کا مطلب راہ چلتوں سے ٹکرا جانا بھی ہے۔ ہالینڈ میرا دوسرا وطن ہے۔''

ہم بستی میں داخل ہو رہے تھے۔

آخری بات جو اس نے کار سے اترنے سے پہلے کہی یہ تھی کہ ''لائبیریا میں ایک گائنے کولوجسٹ gynaecologist ☆ نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ'' شادی کرلو۔ ماں بن جاؤ۔ اور ایک گھرانے کی، پرورش کرو۔''

''کر کیوں نہیں لی؟'' میں نے کہا۔

''ہاہ'' اس کے منہ سے نکلا'' جو بھی پہلا شخص راستے میں ملتا اس سے شادی کر لیتی۔ یو آر اے فول۔ آسیہ نے ایسے ہی کسی لمحے میں تمہیں اپنا شوہر بنالیا ہوگا۔''

پھر اس نے غم زدہ ہو کر کہا۔'' مگر اس کے ماں باپ کو نازی ائر پورٹ سے اٹھا کر نہیں لے گئے ہوں گے نہ وہ دیکھتی رہ گئی ہوگی۔''

''کہ میں ان کے ساتھ نہیں گئی؟'' میں نے کہا "Now yon are being a fool"

وہ ☆ ☆فیشیا بورڈ پر سر ٹیک کر اپنے آنسو چھپا رہی تھی۔

میں کچھ نہیں کہہ سکا۔

آخری بات جو اس نے کار سے اترنے کے بعد کہی یہ تھی'' دنیا میں میری ایک خالہ رہ گئی تھی۔ دو ہفتے ہوئے اس کا اٹلی میں انتقال ہو گیا۔''

اس کی آنکھیں پھر اُمڈ آئیں۔

☆ عورتوں کی بیماریوں کا سرجن۔

☆☆Fascia board۔

(۶)

ڈیڑھ سال اوکینیا میں گزارنے کے بعد اگلی صبح ہماری اس جنگل کی بستی سے روانگی تھی۔ جہاں ہماری پہلی بیٹی پیدا ہوئی تھی، جس کے آس پاس کے گھنے جنگلوں میں ہاتھی اور اژدھے بستے تھے، ندیوں میں ہپوپوٹیمس اور پیڑوں پر بیبون۔ مجھے اس علاقے نے بہت کچھ دیا تھا، مالی آسودگی سے بڑھ کر کوئی چیز جسے میں جانتا تھا عمر بھر یاد رکھوں گا۔ آسیہ کو وہ جگہ چھوڑنے کی خوشی تھی۔ پیدا وہ بھی میری طرح.....ایک باقاعدہ شہر میں ہوئی تھی لیکن اس میں بڑے شہروں میں بسنے والوں کی روح ہے۔ مجھ میں نہیں۔ میں افسردہ سا تھا۔ ہماری رخصتی پر ہمارے اعزاز میں دی ہوئی پارٹیاں یکے بعد دیگرے ختم ہوچکی تھیں جن میں چائے دیکھنے میں نہیں آتی تھی ہر جگہ وھسکی اور بیئر انڈیلی گئی تھیں۔ مقامی بادشاہ (چیف) نے دو دن پہلے مینڈھے کی ایک ران بھیجی تھی۔ کسی گھرانے کے چیف نے گھر کی بنی ہوئی بیڈ پر بچھانے کی دری جسے آسیہ کے ہاتھوں میں تھما کر لانے والی نے ادھوری بیٹھ کر اس کی تعظیم کی تھی۔ نرسنگ اسکول والیوں نے ایک ڈرامہ پیش کیا تھا اور اب یاد نہیں کس نے کیا کیا کچھ۔

بھاری سامان لکڑی کے بڑے صندوقوں میں پہلے ہی ٹرک سے لیگوس بھیجا جاچکا تھا، ساتھ جانے کا سامان کار میں رکھا جاچکا تھا۔ ہمیں صبح صبح نائیجر کے پار لے جانے والی فیری پکڑنی تھی، اگر دیر ہوجاتی تو پھر دوپہر تک وہیں کنارے پر دھوپ میں یا پیڑوں کی چھاؤں میں باری کا انتظار کرنا پڑتا۔

شام کو جب ہم دونوں ربیکا کو au revoir کرنے گئے تو اس نے بھی اور یوا کہتے وقت مجھ سے کہا، ''اگر رات کو جلدی سوجانے کا ارادہ نہیں ہے تو میرے پاس تھوڑی دیر کے لیے آجانا۔ مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

کھانے کے بعد میں نے آسیہ سے کہا، ''تم سوجاؤ مجھے اس بنی اسرائیل کی بیٹی سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

☆ fascia board۔

وہ مسکرائی اور" میں کہانی سننے کا انتظار کروں گی" کہہ کر بچوں کے کمرے میں چلی گئی۔

ربیکا اور میں اس وکے لون میں آرام کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ برابر میں اسٹول پر ایک الاڈن لیمپ، روشن تھا۔ اس کی بات سنتے ہوئے میری نظر بار بار ستاروں جڑے آسمان پر گئی جو چاند کے نہ ہونے سے تاریک تھا۔ ایک طرف نشیب میں نجر بہہ رہا تھا لیکن تاریکی کی وجہ سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پیروں، ہاتھوں اور گردن پر مچھروں کو دور رکھنے کی کریم لگا رکھی تھی اور شاید اس نے بھی۔ میں آہستہ آہستہ لائم کورڈیئل پی رہا تھا جو وہ میرے اور اپنے لیے بنا کر لائی تھی۔ یہ اس میں خوبی تھی کہ اس نے مجھ سے کبھی کوئی "سخت چیز" پینے کا اصرار نہیں کیا۔

"میں خود کو کچھ دنوں سے جنیٹ کی چور سمجھ رہی ہوں۔"

آگے کیا آنے والا ہے میں کچھ کچھ بھانپ گیا۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ آسیہ کو وہ بات بتانے میں اس نے اتنا عرصہ جھجک محسوس کی تھی۔ جنیٹ ہماری مشترکہ دوست تھی..... ایک کینیڈین عورت جس کا شوہر ایلفونسو ایلمائڈہ Alphoso Almeida گوآ کا رہنے والا تھا..... عالمی ادارۂ صحت کا سینٹری انجینئر اور اچھا پینے والا۔ جنیٹ مدبّر قسم کی عورت تھی۔ عمر میں اپنے شوہر سے بڑی لگتی تھی اور بانجھ تھی۔ "مجھے کافی عرصہ سے لگ رہا تھا ایلف مجھ میں ایک نئی قسم کی دلچسپی لے رہا ہے لیکن افسوس یہ ہوتا ہے میں نے اس کی اس دلچسپی سے، سوری خود اپنی کمزوری سے جو اُن دنوں مجھ میں پیدا ہو گئی تھی اپنا دفاع نہیں کیا۔ ہم دونوں جیسے بغیر کہے ایک مقررشدہ پروگرام کے تحت ایک صبح اینوگو میں ملے تھے۔ دھند چھائی ہوئی تھی اور ابھی پوری طرح سے صبح نہیں ہوئی تھی۔ جنیٹ وہاں سے پچپن میل دور تھی اور میں جانتی ہوں بچہ نہ ہونے کے سبب سے وہ کتنی دکھی ہے۔ اس کی ماہواری ختم ہوتی جا رہی ہے۔ مجھی کو ایک بار اُسے بتانا پڑا تھا "تم مینو پوز menopause میں جا رہی ہو۔"

یہ سن کر وہ اور دکھی ہو گئی تھی۔ میرا خیال ہے ایلف کے کردار کو وہ جانتی ہے، باہر سے بہت محبت کرنے والا "پکا کیتھولک کرسچین" اور بھیتر سے عورتوں، بیئر اور پورک کا شیدائی۔

Aladin Lamp☆

(میرے ذہن میں آیا ٹپیکل گوؤن اور پرتگیزی ہے۔)

نہ معلوم مجھ جیسے کتنے واقعے اس کی زندگی میں آئے ہوں گے اور ان میں سے نہ معلوم کتنوں سے جینٹ آگاہ ہوگی۔ ویسے وہ شوہر کی کسی اور ممکنہ زندگی کی کھوج میں رہنے والی عورت نہیں ہے۔ نہ اس نے کبھی ایلف کی برائی مجھ سے کی۔

اس دن ٹورَ پر نکلتے ہوئے ایلف نے جینٹ سے کہا تھا" ڈارلنگ میں کل شام تک واپس آؤں گا۔ اینوگو میں دو میٹنگز ہیں۔ ہمیں وہاں سے کچھ چاہئے ہے؟"

.جینٹ نے کہا۔" تم اپنے سینے کی حفاظت کرنا، کھانسی زکام نہ ہونے پائیں۔ گھر میں سب کچھ ہے۔ بس آلو ختم ہو گئے ہیں۔"

(اس قصباتی شہر میں آلو نہیں ملتے تھے) باہر جاتے ہوئے ایلیف نے اپنا سلیٹی گال جنیٹ کے سفید رخسار سے چھوایا۔

"میں بھی ٹورَ پر نکل رہی تھی اور حالانکہ اینوگو جانا میرے پروگرام میں شامل نہیں تھا لیکن جیسے مجھے کوئی طاقت وہاں کھینچ رہی تھی۔ یہ دھیمی آنچ کا لگاؤ شاید میں چاہتی تھی ہو ہوا کر ختم ہوجائے۔ کافی دنوں سے اس کے بارے میں مجھے بے چینی تھی۔ میرا خیال ہے تمہیں ان جذبات کا تجربہ ہوگا اور آسیہ کو بھی۔ شاید میں اس کرید میں تھی کہ وہ واقعی مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے یا یہ میری غلط فہمی ہے۔

(اگر میں مسکرایا تھا تو میرا خیال ہے مدھم روشنی میں اس نے نہیں دیکھا)

"میں رورل ہیلتھ سینٹر میں اپنا کام کرتی رہی لیکن جانتی تھی مجھے آج واپس گھر نہیں لوٹنا ہے۔ اور وہی ہوا شام کو میں اینوگو میں تھی۔

"ایک شلیے chalet لے کر میں نے اپنا سامان اس میں رکھوایا، نوکر سرونٹ کوارٹرز میں چلا گیا اور میں ڈنر کے لیے ریسٹوراں چلی گئی۔ میں نے ایک بوتل لوکل بریوری کی بیئر منگوائی۔ میں پینے کی عادی نہیں ہوں۔ یا ہوں؟"

میں نے کہا۔"نہیں! تمہارے ہاتھ میں آ کر تو شراب ہولی واٹر بن جاتی ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔

''میرا خیال تھا ایلف وہاں ہوگا۔لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔ میں بے وجہ کھانے میں وقت لگا رہی تھی۔کوفی کے بعد بھی میں کافی دیر وہاں بیٹھی رہی۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی کبھی کبھی مجھے اپنے اندر کی آواز سنائی دی تھی: ہینز اور ڈاکٹر بھورے اور ڈاکٹر نورمن کا تجربہ تمہارے لیے کافی نہیں ہے کیا؟ لیکن وہ آواز اتنے زور کی نہیں تھی کہ مجھے مجبور کر دیتی کہ میں واپس کار میں سامان رکھواؤں اور گھر کے لیے چل دوں۔

رات کو جب میں سونے جا رہی تھی مجھے ایک کار کے آنے کی آواز سنائی دی۔ اور اس کے رُکنے کی۔ میں جانتی تھی کون تھا۔ میں نے ناول بند کر کے لیمپ آف کر دیا۔ پھر کچھ دیر بعد میرے شیلے کے دروازے تک قدموں کی آواز آئی اور رک گئی۔ پھر دروازے پر کھٹکا ہوا۔ایک بار، دو بار، تین بار اور دھیمی آواز میں مجھے اپنا نام سنائی دیا۔لیکن میں خاموش رہی کیونکہ جانتی تھی اس وقت ایک مرد مہمان کو اپنے کمرے میں آنے دینے کا کیا مطلب ہوگا اور بات کہاں تک جائے گی جو میں نہیں چاہتی تھی۔ پچھتاوے کی تکلیف کو میں جانتی ہوں۔

کچھ دیر بعد اس کے واپس جانے کے قدموں کی آواز کم ہوتی گئی۔

صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی۔ میں نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ اس وقت سارے ماحول پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔شاید جو میں چاہ رہی تھی وہی ہونا تھا۔

ایلف کو میں نے تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا۔اس نے نزدیک آ کر کہا۔

''رات تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟''

''مجھے کیا معلوم تھا تم ہو اور اتنی رات گئے اپنی بیوی کا حال کہنے آئے ہو۔ "Is she well"

بیوی کے ذکر نے اس کے جذبات کی تندی کو کم کر دیا۔

اس نے کہا،''تمہیں معلوم تھا میں یہاں ہوں گا۔''

''اور تمہیں معلوم تھا میں یہاں ہوں گی؟''

''ہاں معلوم تھا ورنہ کیوں تم میرے گھر سے نکلتے وقت جینٹ کو بتاتیں کہ رورل ہیلتھ سینٹر کا کام ختم کر کے اینوگو جاؤ گی۔''

میں دروازے کو پکڑے کھڑی رہی۔ ہاں میں نے اُسے بند نہیں کیا۔ اس کا میں اقرار کرتی ہوں۔ ان باتوں کو تم سمجھتے ہو گے۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے میری کمر میں بانہیں ڈال کر مجھے پیار کیا۔ وہ اُسے میں نے کر لینے دیا..... جو میری غلطی تھی۔ لیکن میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

''میرا خیال ہے ایلف جیسے مرد جب ان کی شادی کو ایک عرصہ ہو جاتا ہے اور گھر میں بچہ نہیں لا پاتے ہیں بیوی سے قربت کو بے گار سمجھنے لگتے ہیں۔

''جنیٹ ان عورتوں میں سے ہے یا میرا خیال ہے، جو بچہ نہ ہونے کے باوجود بھی اپنے مرد سے اکتا نہیں جاتی ہیں۔ میں اس کے دکھ کو سمجھتی تھی اور جانتی تھی اس جنگل میں سوائے میرے اور مچھروں اور سینڈ فلائز کے اور کون اس کا دوست ہے۔

ایلف نے مظلومیت سے کہا، ''رات تم نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔''

میں نے کہا، ''میرا خیال تھا تم نشے میں ہو اور جینٹ کا دروازہ سمجھ کر کھٹکھٹا رہے ہو۔''

''لیکن میں تمہارا نام لے کر پکار رہا تھا۔''

''میں خاموش رہی حالانکہ میں کہنا چاہ رہی تھی کہ بات بہت بڑھ چکی ہے اور اُسے ختم کر دینا چاہیئے۔ اس کے اکیلے پن کو محسوس کر کے میں نے دروازہ کھولا تھا اور ایک دقیقے کے لیے اپنے آپ پر بے رحمی کی تھی۔

''اگلی ملاقات پر اس نے پتہ نہیں اپنی سوگواری سے یا شکایتاً کہا ''اب میں تم سے تنہائی میں ملنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں فادر فرانسس سے اپنے گناہ کا اقرار کر چکا ہوں۔''

میں ہنس پڑی۔

اس نے پوچھا، ''کیوں ہنسیں؟''

میں نے کہا، ''اقرار بھی کیا تو اپنے پینے والے ساتھی سے۔''

یہ خاموش ڈرامہ بہت عرصہ سے چل رہا تھا اور شیلے کے دروازے پر ملنا اس کا ڈروپ کرٹن تھا۔''

مجھے تعجب تھا کہ میں اور آسیہ اسی چھوٹے سے شہر کے ایک گورنمنٹ بنگلو میں رہ رہے تھے جہاں ایلف اور جینٹ کا بھی بنگلو تھا اور ان کے اور ہمارے درمیان ربیکا کا۔ اور ہمیں ان سب باتوں کی مطلق خبر نہیں تھی۔ ساری کتھا سن کر بیوی نے البتہ بتایا اُس نے کئی بار ایلف کو ربیکا کے گھر اکیلے جاتے دیکھا تھا اور اُسے تعجب ہوا تھا وہ وہاں کیوں جاتا تھا۔ وہ پبلک ہیلتھ کی نرس تھی اور وہ انجینئر۔ کون سا کسی ڈیپ لیول پانی کے لیے بورنگ کرانے میں ربیکا کی رائے لینے گیا ہوگا جس کے لیے وہ میرے پاس آتا تھا۔ یا ریب نے ایلف کو عورتوں میں ابورشن ریٹ کو کم کرنے کا مشورہ دینے کے لیے بلایا ہوگا جس کی ضرورت یہاں کسی عورت کو ہوتی ہی نہیں ہے وہ شادی شدہ ہو یا نہ ہو یا شوہر کو مرے سال گزر چکے ہوں۔'' آپ کو اگر وہاں جاتے دیکھتی تو سمجھتی کوئی کام ہوگا۔ کسی کوڑھیوں کے کلینک میں دوا ختم ہوگئی ہوگی یا کہیں سے چیچک کے پھوٹ آنے کی اطلاع ملی ہوگی اور آپ اس کے پاس معاملہ فہمی کے لیے گئے ہوں گے۔''

''اس صبح کے بعد میں مغموم رہنے لگی۔ لیکن جب خود سے بیزاری حد سے زیادہ بڑھی تو میں نے فیصلہ کیا مجھے بھی اقرار خطا کرنا چاہیے اور چونکہ یہاں کوئی سائیکوتھیراپسٹ نہیں ہے تو اس کام کے لیے کیتھولک فادر سے بہتر کون ہوسکتا تھا جو اقرار گناہ سننے کے لیے ہی دنیا میں آتا ہے۔ لیکن وہ نہیں جس کے پاس ایلف گیا تھا۔ تمہیں میں یہ حادثہ..... میں اسے حادثہ ہی کہوں گی..... نہیں بتانا چاہتی تھی کیونکہ تم میری زندگی کے ایسے تین چار واقعے سن چکے ہو اور سوچتے ہو گے کہ بار بار میں ایک ہی پتھر سے ٹھوکر کیوں کھاتی ہوں۔ میں نے فادر جورڈن سے بات کرنے کی دوبارہ کوشش کی۔ پہلی بار ناکام لوٹ آئی وہ اپنے کام میں لگا تھا۔ دوسری بار میں اس کے پاس کافی دیر تک بیٹھی۔ وہ سوویت یونین میں بیک وقت تین برسراقتدار آنے والے سربراہوں کی بات کرتا رہا، بریز نیف، کوسی گن اور ایک تیسرا جنہیں وہ جنگلی کتوں کا غول کہہ رہا

تھا..... ہر مخالف کو پھاڑ کھانے کو تیار۔ ان کی تصویر اس نے ایک امریکی رسالے کے سرورق پر، میرا بازو پکڑ کر، میری آنکھوں کے سامنے کر کے دکھائی۔ میں نے اپنا بازو دوبارہ اپنے پہلو میں کرلیا۔ پھر وہ اپنے علاقے میں شکار کی بات کرتا رہا یہاں تک کہ دوپہر ہوگئی۔ بات کرتے میں دو ایک بار اس نے اپنا ہاتھ جیسے بے دھیان میں میری ران پر رکھنا چاہا لیکن میں ہر بار ہٹ گئی۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا اور وہ مصر رہا کہ میں اس کے ساتھ کھانا کھاؤں اور جب تک کک کھانا تیار کرے اس کے ساتھ پام وائن (تاڑی) پیوں۔

میں وہاں سے اُٹھ آئی۔ وہ پیتا رہا۔

(اور واقعی اس چھوٹے سے شہر میں جسے ہم اگلی صبح چھوڑ رہے تھے۔ کینیڈین اور آئرش پادری پیتے بہت تھے..... شراب بھی اور تاڑی بھی۔ اور مجھے یقین تھا اگر ان میں سے کسی کے پاس جا کر ریب اپنا دکھڑا روتی تو اس کے نزدیک زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی کہ وہ یسوع کے بھیڑوں کے گلے میں داخل ہوجائے اور گناہ کا کیا تھا وہ تو ہر ایک سے سرزد ہوتا ہی رہتا ہے، انسان بنا ہی گناہ کرنے کے لیے ہے۔ کرسچین بن جانے کے بعد ایک بار کے اقرار میں وہ بوجھل احساس اس کے ضمیر سے دھل جاتا اور وہ ایسی ہوجاتی جیسے چکنی چٹان جس پر مٹی ٹکتی ہے نہ سبزہ اگتا ہے۔ لیکن بغیر اپنا مذہب تبدیل کیے یہ کیسے ممکن تھا!

یہاں میں اپنے بارے میں اتنی بات بتاتا چلوں نہ مجھے یہودیوں سے کد ہے، نہ عیسائیوں سے اور گو میں کسی سیاہ عورت کی محبت میں گرفتار نہیں ہوا مجھے ان کی رنگت بھی اتنی ہی پسند ہے جتنی گندمی، سفید اور پیلی عورتوں کی۔

''اداسی اپنی جگہ پر رہی لیکن اس کا میرے کام پر اثر نہیں پڑا۔ اسی طرح گاؤں اور قریوں کے ٹور کرتی رہی۔ ورنہ تم خود میری لاپرواہی نوٹ کر لیتے اور جتادیتے۔ ایک بات بتاتی چلوں تم کافی سخت ٹاسک ماسٹر ہو لیکن اس بات کا میں نے کبھی بُرا نہیں مانا ہے بلکہ ہمیشہ سراہا ہے۔

(میں نے ایک بے آواز تالی بجائی)

میں نے خیالات سے اغماض نہیں کیا اور خود کو بتایا کہ یہ زندگی کا ایک گزر جانے والا مختصر سا دور ہے، جس طرح تھیٹر میں کامیڈی سین ہوتا ہے، نہ ہو تو دیکھنے والے لگاتار سنجیدہ کہانی سمجھتے سمجھتے تھک جائیں۔ ایک وقفے سے زیادہ کچھ نہیں اور بسر جائے گا۔

''لیکن بیرا نہیں اور مجھے اپنا سر بھاری بھاری اور سینہ بند بند لگتا تھا تا آنکہ میں نے پروٹسٹنٹ بشپ سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ میں اُسے اپنے دماغ اور سینے کی کیفیت تھوڑی بہت بتاتی اور ہوسکتا تھا وہ کسی ڈاکٹر کے پاس دوا کے لیے جانے کا مشورہ دیتا اور اتنے ہی سے کام بن جاتا۔

لیکن اس کا انتظار کرتے کرتے مجھے خیال آیا، خیال سے چھٹکارا تو تب ہی مل سکتا ہے جب میں جینٹ سے کہوں میں نے تمہاری خیانت کی ہے اور یہ بھی کہ اقرار سے فائدے کی امید جب ہی ہوسکتی ہے جب اس پر کسی کا پورا اعتقاد ہو..... خواہ وہ سائیکو اینالسٹ ہو خواہ کوئی مذہبی پروفیشنل ہستی۔ میں نے پڑھا ہے چار چار سال لمبے سائیکو انالسس بے کار جاتے ہیں اور ان پر صرفہ برباد (میں نے کہا'' صرفہ برباد نہیں، چار سال میں سائیکو انالسس کرانے والا کرنے والے کے دماغ سے سوچنے لگتا ہے، اپنا دماغ کھو بیٹھتا ہے۔'' لیکن وہ رکی نہیں اپنی بات کہتی رہی) یوں بھی پروٹسٹنٹ بشپ کا خود اقرار پر اعتقاد نہیں ہوتا ہے۔ ریورینڈ جیمس ہوویل مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آئے لیکن وہ جانتی تھی وہ ہر ایک سے ہر معاملے میں اسی طرح پیش آتے ہیں، جس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے کسی سے بھی نہیں۔ ان کا برتاؤ پروفیشنل نیکی کا تھا جس کے لیے ان کی تربیت نیو یارک میں کی گئی ہوگی۔

''ہم کچھ دیر کوڑھیوں کی باتیں کرتے رہے۔ ان کے علاقے سے پچھلے دنوں ہی کچھ کوڑھیوں کو چنگا ہوجانے کے سرٹیفکیٹ ایک جلسے میں دیئے گئے تھے جو پیڑوں کے سائے میں ہوا تھا۔ میں اس جلسے میں شریک نہیں ہوسکی تھی۔ (میں وہاں موجود تھا۔ میں نے کہا)

''میں نے جب انہیں اپنی مشکل کے بارے میں اشاروں کنایوں سے بتانا چاہا کہ ایک لڑکی جو لڑکی نہیں رہی ہے، عورت ہے اس کے سوسائٹی میں زندہ رہنے کے خطرے، خاص طور

سے اگر وہ آؤٹ ڈور کام کرتی ہے۔

انہوں نے کہا، ''تم صحیح کہہ رہی ہو۔ ایک عورت جس کا پشتی بان کوئی مرد نہیں ہے اور وہ ابھی بوڑھی بھی نہیں ہوئی ہے ہر ملنے والا مرد اس پر حرص کی نگاہیں رکھتا ہے اس لیے میں لڑکیوں کے غیر شادی شدہ رہنے کے حق میں نہیں ہوں۔''

''میں کہنا چاہتی تھی ہر مرد بھی جس کی بیوی اس سے عمر میں بڑی ہو یا بڑی لگنے لگی ہو اور جس کے مینسیز menses کے ختم ہو جانے کا زمانہ آ گیا ہو اور وہ خود ابھی بوڑھا نہ ہوا ہو، ہر عورت اور لڑکی سے اپنا شکار کرانے کو تیار رہتا ہے، یا اُسے لگتا ہے ہر جوان عورت یا لڑکی اس کی پاکیزگی کو شکست دینے پر تلی ہوئی ہے۔''

لیکن میں خاموشی سے ان کا شکریہ ادا کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

لیکن میری اندر کی خلش مٹی نہیں۔ حالانکہ میں سمجھ چکی تھی میری تنہا زندگی ایک پیٹرن اختیار کر چکی ہے۔ جانتی ہوں اس راستے میں ٹھوکر کھاؤں گی لیکن کوئی قوت اسی راستے پر لے چلتی ہے اور عین ٹھوکر کھاتے وقت وہاں سے بھاگ کھڑی ہوتی ہوں۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک سر بھاری بھاری لگتا ہے اور سینہ بند بند۔ جی چاہتا ہے مجھے گیسٹاپو سے بچانے والے فرضی ماں باپ میرے پاس ہوں، میں ان کو دُکھڑا سناؤں.....''

میں نے کہا۔ ''اور وہ مجھے ڈانٹیں ماریں۔''

''نہیں انہوں نے نہ مجھے کبھی ڈانٹا تھا، نہ مارا تھا۔ اُن سے بات کر کے میرا جی ہلکا ہو جاتا۔'' اس کے بعد وہ کافی دیر تک خاموش رہی جیسے اپنے منتشر ہو جانے والے خیالات کو سمیٹ رہی ہو۔

''ان دو کے بعد کون رہ گیا تھا۔ کونوینٹ کی ننیں۔ اسی ادھیڑ بن میں ایک دن میں کونسوینٹ گئی۔ تیسرا پہر تھا۔ میرا وہاں جانا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مدر فلومینا برآمدے میں بیٹھی تھی اور گرمی کی وجہ سے اس نے سر کو ننگا کر رکھا تھا۔ کپڑے بھی بہت مختصر تھے اور کندھے کھلے ہوئے تھے۔ میں اس کے گنجے سر کی وجہ سے اس سے نظریں چُرا رہی تھی کہ دیکھوں گی تو نظریں

سر پر ہی جائیں گی۔ اس سے پہلے میں نے کسی سرمنڈی عورت کو نہیں دیکھا تھا۔ افریقی عورتوں میں سے اکثر سر پر مشین چلواتی ہیں لیکن ان کا سرمنڈا ہوا نہیں ہوتا ہے۔ بالوں میں مختلف نمونوں کی کیاریاں بنوالیتی ہیں۔ تمہیں پتہ ہے۔

''میری جو خواہش تھی اندر ہی بجھ گئی کہ جس نے اس حد تک اپنے جذبات کو کچل رکھا ہو اور مرد کے لیے ناقابل قبول، وہ کسی بھٹک جانے والی روح کے جذبات کے مدوجزر کو کیسے سمجھ سکتی ہے۔''

مجھے یاد آیا ایک دن کار میں وہ میرے ساتھ کسی ہیلتھ سینٹر سے لوٹ رہی تھی اور ہم اپنے ضلع کے مقامی چیف کی دی ہوئی پارٹی کے بارے میں بات کررہے تھے جہاں کئی ایک ڈاکٹر تھے، کئی انجینئر، ایجوکیشن آفیسرز اور زراعت کے ماہر۔ زیادہ تر باہر کے لوگ تھے۔ سب کو بغیر بیویوں کے بلایا گیا تھا کیونکہ چیف کی بیویاں سب کی سب حاجیانی تھیں اور محل کی سب عورتیں سات سے ستر سال عمر تک کی پردے میں رہتی تھیں یا پردے میں رکھی جاتی تھیں۔ پینے کے لیے شراب اور ایریٹیڈز ڈرنکس تھیں۔ کھانے کے لیے کچھ نہیں۔

میں اس نوعیت کی کافی پارٹیوں میں شریک ہو چکا تھا کہہ بیٹھا۔ ''یہ محترم فادر لوگ پیتے بہت ہیں۔'' میرے ذہن میں اس شام وہاں نظر آنے والے کینیڈین اور آئرش پادری تھے۔ اس پر اس نے تلخ لہجے میں کہا ''ان کا پیئے رہنا ہی اچھا ہے، نہ پیئے ہوں تو ننوں کو ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے۔ سدا ان کا پیچھا کیا کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''گنجے سر کے باوجود؟'' اور خود ہی جواب دیا۔

''رسائی پاجانے پر سر ڈھانک دیتے ہوں گے انہی کے ہیڈ اسکارف سے۔''

ربیکا میری بات سمجھی نہیں۔ مجھے خیال آیا ''اب بھلا جو فادروں سے پیچھا چھڑاتی پھرتی ہوگی وہ کیوں نہیں ایک عام عورت اور وہ بھی اسی کی طرح یوروپئن عورت کے جذبات کو نہیں سمجھتی۔''

''آخر میں بچے تم اور موزلیم پریچر۔ موزلم پریچر (مسلم) اور میرے درمیان زبان کی

قدغن تھی۔ نہ ہوتی تو شاید چلی جاتی کہ وہ اپنے مذہب کے حساب سے میرا کچھ دل رکھ لے۔ مگر وہ، وہ ہے، جسے ہم ہولانز (ڈچ) میں واداکوزا کہتے ہیں، بے مصرف، بے کار محض۔ بس جماعت کی نماز پڑھانے کے کام کا۔ پتہ نہیں وہ عربی جانتا بھی ہے یا نہیں۔''

میں ہنس پڑا۔

''تم بُرا تو نہیں مانتے؟''

''اور ایک گوری عورت سے اپنی Pidgin English (ملوواں زبان) میں بات کرتا ہوا جھجکتا اور شرماتا۔''

میں نے کہا۔''ریب ریلفونسو ایلمایڈ سے معاملہ کہاں تک بڑھا تھا؟''

''زیادہ نہیں! لیکن اہمیت اس کی نہیں ہے۔ اہمیت اس کی ہے کہ مجھے معلوم تھا جینٹ کتنی تنہا ہے اور اداس کہ بچے نہیں ہیں۔ ایک ایسی شادی میں گرفتار جو ٹوٹ نہیں سکتی ہے اور اب بچے کی امید بھی ختم ہو رہی ہے۔ کینیڈا میں ہوتی تو اتنی تنہا خود کو محسوس نہ کرتی۔ ایلف ٹور پر رہتا ہے۔ جب میں ٹور پر نہ ہوں تو میں اس کی واحد مونس ہوتی ہوں، یا پیڑوں پر بیٹھے ہوئے مور جنہیں وہ گنی کورن ڈالتی ہے اور انہیں چگ کر وہ پھر اُڑ کر اُونچے پیڑوں پر جا بیٹھتے ہیں۔ میں جانتی ہوں وہ ان کی گردن پر ہاتھ پھیرنا چاہتی ہوگی لیکن .....اور میں نے اس کے ساتھ یہ گپ شپ کی۔''

رات کافی جا چکی تھی۔ مجھے صبح جلدی اٹھنا تھا اور سفر طویل تھا۔ میں نے اُسے ڈھیر بندھانے کے لیے کہا،''ربیکا یہ سب کچھ اسی طرح شروع ہوا تھا۔ غم کے دنوں سے، خوشی کے دور سے نہیں۔ تمہارا ماضی بہت مغموم ہے اور تمہارا غم تمہیں صرف ان لمحوں میں چھوڑتا ہے جب تم خود کو کسی کی لذت کوشی کا شکار بننے دیتی ہو۔''

اس کے منہ سے نکلا۔''مکمل طور سے نہیں۔''

''تمہارے ماں باپ تمہیں چھوڑ کر جاتے ہوئے صرف ایک طرح سے خوشی محسوس کر سکتے تھے کہ ان کی بیٹی زندہ اور محفوظ ہے۔ تم ایک لڑکی سے جس کے ماں باپ کو نازی ایئر

پورٹ سے یقینی موت کی طرف لے گئے تھے اور کیا امید رکھ سکتی ہو؟ جب وہ دس، بارہ یا چودہ کی
تھی اور جس نے اس عمل کو خاموشی سے دیکھا تھا ان کے لیے روئی نہیں تھی اور ان میں بھی اتنی
ہمت نہیں تھی کہ جاتے جاتے اپنی بیٹی کو آخری بار پلٹ کر دیکھتے کیونکہ اگر ایسا کرتے تو راز راز
نہیں رہتا۔ تم نے جذبات کے طوفان میں خود کو ساکت رکھنا سیکھا ہے لیکن حالات تمہیں اس بچ
پر بار بار لے جاتے ہیں جس پر بیٹھ کر تم نے ماں باپ کو موت کی طرف جاتے بے بسی سے
دیکھا تھا۔ اس بچ پر نہ پہنچنا تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ تب سے تمہارے جذبات الٹ پلٹ
ہیں۔"

اس نے ایک چھٹکارے کی سی سانس چھوڑی۔

اس کے تھوڑے بہت الفاظ استعمال کرتا ہوا میں اس کے کڑوے بادام کے سے احساسِ
گناہ کو نگلنے کے لائق بنا رہا تھا اور یہ وہ کام تھا جسے نہ کیتھولک فادر جورڈن کر سکتا تھا نہ ریورینڈ
جیمس ہوویل، نہ کوئی مالم (مسلم) امام مسجد نہ مدر فلومینا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اس کا اسٹیورڈ کب کا سونے جا چکا تھا۔ میں نے اُسے وہیں رُکے رہنے
کو کہا اور لون کی میز اور ایک کرسی اندر لے گیا۔ دوسرے پھیرے کے لیے میں نے لیمپ
اُسے تھمایا اور دوسری کرسی اور اسٹول اٹھا لیے۔ وہ لیمپ لیے لیے میرے پیچھے آئی۔

کمرے کے دروازے پر ☆ au revoir کہنے سے پہلے میں نے کہا، "تمہارا ضمیر
ایک راکشس ہے (جس کے معنی وہ جانتی تھی) ہر لمحے تمہیں کھا جانے کو تیار۔ جن کے کندھوں
پر اس راکشس کا بوجھ نہیں ہوتا ہے بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں اچھا برا کچھ نہیں جانتے۔
اُسے اتار پھینکو۔" پھر واپسی کے لیے مڑتے ہوئے میں نے کہا۔

"مگر اگر کوئی صحیح آدمی شادی کے لیے تم میں دلچسپی لے تو اُسے اپنی زندگی سے مت
نکال پھینکنا۔ اُسے کندھوں کی جگہ اپنے سر پر بٹھائے رکھنا۔"

اس نے کہا۔ "تمہاری بات میں یاد رکھوں گی۔" "bon voyage" ☆☆

☆ فی الوقت اچھا رخصت۔ ☆☆ سفر اچھا کٹے۔

(۷)

آج تک وہ اپنی ایک غلطی اور مبہم اُمید کو سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ اُمید ایک طویل عرصہ تک اُمید رہ کر ذہن کا بوجھ بن جاتی ہے اس حقیقت کو وہ ابھی تک سمجھ نہیں پائی تھی۔ ماضی میں دور تک پھیلا ہوا دُکھ اس کی آنکھوں سے جھانک رہا تھا۔ تھوڑا بہت ہمیشہ سے تھا، جب سے میں نے اُسے جانا تھا اور اُسے اس نے خود اُس جھاڑی کی طرح پانی دے دے کر پروان چڑھایا تھا جو کسی کو پسند نہ ہو اور پھر بھی یہ سمجھ کر کہ گھر کی نگہداشت کرتی ہے اس کی سیوا کرتا رہے، اُسے کاٹ کر اس کی جگہ کوئی خوب صورت پتوں والی جھاڑی نہ لگائے۔

آج اس نے کوفی کی پیالی کے سامنے بیٹھے ہوئے ایلفونسو المائیڈا کا ذکر آ جانے پر پہلی بار مجھے بتایا ایلف، اولا ٹوڈرا سے کم سنگدل نہیں تھا۔ ایک دن جب میں اس کے گھر میں بیٹھی تھی اور جینٹ کچن میں میرے لیے کچھ بنانے گئی تھی اس نے کہا تھا، ''سوتم نے اپنے جسم کو ڈاکٹر ایڈے یمی کے حوالے کر دیا، اور مجھے اندر آنے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔''

''وہ کیا سمجھتا تھا میں ہور (whore) ہوں۔ ہر کس و ناکس کو.....''

''یہ جب کی بات ہے جب ڈیوڈ پیٹ میں تھا اور اولا ٹوورا، سوری ڈاکٹر ایڈے یمی اوکینا سے غائب ہو چکا تھا۔

میں نے کہا، ''اگر ایسا کیا ہوتا تو کیا تم بھی ڈاکٹر ایڈے یمی کی طرح میری دنیا سے غائب نہیں ہو جاتے! بلکہ میرا خیال ہے راز کُھل جانے پر تم جینٹ کی دنیا سے بھی چوروں کی طرح فرار ہو جاتے۔''

اس نے کہا، ''نہیں! میں کسی کو پتہ نہیں چلنے دیتا کہ تم مجھ سے.....''

''اور بچے کا کیا ہوتا؟''

''اُسے چرچ لے لیتا۔''

''اس کی بات سُنی تم نے۔ ایک انڈین کی بات جو خود کو تمام افریقیوں سے برتر سمجھتے ہیں۔ جینٹ اس سے ہزار درجے برتر تھی۔ اُسے مجھ سے ہمدردی تھی۔ سچی ہمدردی جس میں

استہزا کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ میں نے کوئی چوری نہیں کی تھی، کھلم کھلا اپنا گھر بسانے کا خواب دیکھا تھا جو اس کے یہاں کی لڑکیاں بھی دیکھتی ہیں ورنہ شادی کو کیوں راضی ہو جائیں۔

''مجھ ہر وقت متلی رہتی تھی اور کچھ کھا نہیں سکتی تھی۔ اس وقت بھی وہ میرے لیے لیمن بارلی اور ایک سینڈوچ بنانے گئی تھی۔

''ایلف کی بات اولا نُودرا کی اس بات سے کم انسانی جذبے سے خالی نہیں تھی جب وہ مجھ پر زور دیتا رہا تھا کہ میں بچے کو نکلوا دوں۔ وہ جس بچے کا باپ تھا خود اُسے میرے جسم سے نکال پھینکنا چاہتا تھا اور مجھ سے بار بار کہہ چکا تھا ''تم بھی بچے سے پیچھا چھڑا لو۔ تکلیف نہیں ہوگی۔''

''ہا ہا۔ میں تو سمجھتی ہوں دونوں نے بغیر اینستھیزیا کے میرے جذبات کی جراحت کر ڈالی۔ نہ ایک کی ڈگری منسٹری آف ہیلتھ نے کینسل کی نہ دوسرے کو چرچ نے چرچ نکالا (excommunicate) دیا۔''

میں نے اپنے سامنے کی پیالی اور گلاس کو اٹھا کر میز کے وسط میں رکھ دیا، جیب سے رومال نکال کر میز پر پھیلایا اور اس کی سلوٹیں دور کرنے لگا۔ وہ اپنی بات بھول کر میرے اس کام کو دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ میں رومال کا چوہا بنا رہا تھا اور جب بن گیا تو اُسے ایک ہاتھ میں لے کر دوسرے سے سہلانے لگا۔ اس نے پوچھا، ''کیا ہے؟'' میں نے کہا، ''میرا پالتو چوہا۔'' پھر جب میں نے اُسے اس کی طرف پُھدکایا تو وہ ہنس پڑی اور بولی، ''تم ہمیشہ بچے رہو گے۔'' میں نے کہا، ''نہیں میں روتے بچوں کو خوش کرتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اسی طرح تم نے ایک دن کنول کا ہار بنایا تھا۔ یاد ہے جس دن ہم انمبرا ندی کو پار کر رہے تھے۔''

''جس کے ہماری طرف کے کنارے پر ایک عورت بندر کے گوشت اور سفید بیجوں کا سرخ سالن گاہکوں کو دے رہی تھی۔ یاد ہے۔ اور وہ ہار تمہیں پہنایا تھا؟''

لیکن اس کی یہ خوشی بس تھوڑی دیر کی تھی جس طرح ہالینڈ میں ہوتا ہوگا۔ تھوڑی دیر ڈیوڈ کے ساتھ کھیلی، اس کی کسی بات پر ہنسی، تالی بجائی اور پھر اپنے دل کے دُکھ کے پاتال میں اُتر گئی۔

میں اپنی پریشانی کو بھولنا چاہتا تھا لیکن اپنے ساتھ وہ مجھے بھی اپنے دُکھ کی دنیا میں لیے جاتی تھی۔ اس صبح جو خوشی مجھے اس سے مل کر ہوئی تھی وہ آہستہ آہستہ سورج کی پہلی شعاؤں کے پڑنے سے شبنم کے قطروں کی طرح اڑتی جارہی تھی۔

(۸)

میں نے رومال کے چوہے کو آزاد کیا اور منہ پونچھ کر رومال کو جیب میں رکھ لیا۔ وہ پتہ نہیں بڑبڑا رہی تھی یا مجھ سے مخاطب تھی۔

''میرے ماں باپ نے میری زندگی بچانے کے لیے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اور گیسٹاپو کے انہیں لے جاتے وقت انہوں نے اپنے دلوں پر کتنا جبر کیا ہوگا کہ مجھے پلٹ کر نہ دیکھیں۔ آخری بار کا دیکھنا کتنا جذبات سے پُر ہوتا ہے، کتنا اہم، ورنہ اس کی خلش دل میں رہ جاتی ہے۔ لوگ جاتی ٹرین سے سر باہر نکال نکال کر اور دروازے سے لٹک لٹک کر پیچھے رہ جانے والے کو دیکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہی دور پھر آجائے تو مجھے شک ہے کہ میں خود کو ڈیوڈ پر ایک آخری نظر ڈالنے سے روک سکوں گی۔ میری محبت خودغرضی کی ہے کہ وہ مجھے خوشی دینے کے لیے دنیا میں آیا ہے۔ میری زندگی کی تنہائی دور کرنے۔''

''میری زندگی ان کے نزدیک بڑی قیمتی ہوگی جس کی حفاظت وہ آخری دم تک کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے مجھے گناہ سے دور رہنا چاہیے تھا۔

''میں ان خیالات سے لڑتی رہتی ہوں اور پھر خود ہی مجھے اپنی اس حرکت پر تعجب ہوتا ہے کہ کب تک یہ تھکا دینے والا معرکہ میں جاری رکھ سکوں گی۔ مجھے ڈیوڈ کے لیے زندہ رہنا ہے۔ یہ بوجھ مجھے تنہا اٹھانا ہے۔ پھر مجھے اگلے ہی لمحے خیال آتا ہے میں کیسے ضمیر کی اس خلش کے ساتھ جی سکتی ہوں۔ یہ کشمکش تو اگر میں کنسنٹریشن کیمپ میں رہ رہی ہوتی اور مجھے انتظار ہوتا کہ کب گیس چیمبر میں پہنچائی جاؤں گی تو بھی نہ رکتی۔ یہ کشمکش تو اس سے مختلف نہ ہوتی اگر.....''

میں نے کہا، ''انسان ننگا پیدا ہوتا ہے اور انتہائے جذبات میں ننگا ہوجانے میں اُسے عار نہیں آتا ہے۔ ایسے ایک لمحے میں تم نے خود کو اولا ٹوودرا، ایڈے یمی کے سپرد کردیا تھا۔ اس

وقت تم، تم نہیں تھیں بنیادی انسان تھیں "The higher biological creature"

''اگر میں اسرائیل میں رہ رہی ہوتی۔'' اس نے اپنا جملہ مکمل کیا۔

''کیسے؟''

''سوال کیسے کا نہیں ہے کب تک کا ہے۔ کب تک جنگ کے لیے خود کو تیار رکھنا جاری رکھا جا سکتا ہے۔ میں خود سے وعدہ کرتی ہوں اب ان ڈپریشن میں لے جانے والے خیالات کو نہ آنے دوں گی لیکن وہ فلسطینیوں کی طرح میری بے خبری میں حملہ کر جاتے ہیں۔ کب تک میں اپنے دماغ پر پہرہ دے سکتی ہوں۔''

''ڈیوڈ کی موجودگی میں میرے اندر کی یہ جنگ بڑھ جاتی ہے۔ ایک طرح سے میں اس سے ڈرنے لگی ہوں۔ جیسے میں نے اس کی چوری کی ہے۔ کاہے کی؟ اس کے باپ کی۔ کیوں نہیں میں نے ایسے شخص کو راہداری دی تھی جو شادی یا بے شادی میرے ساتھ تا عمر رہتا۔ میں نے تمہیں اس ڈاکٹر کے بارے میں بتایا تھا جس کے ساتھ میں نے کیمرون میں کام کیا تھا جس کی بیوی ڈاروِن میں تھی۔ وہ ڈیسنٹ آدمی تھا.....''

میں نے کہا، ''مجھے یاد ہے۔''

جب مجھے وہ ڈیوڈ کے ہالینڈ میں چھوڑ کر آنے کی وجہ بتا رہی تھی مجھے معلوم تھا اس کے دماغ میں زندہ رہنے اور موت کی سزا بھگتنے کے خوف سے کشمکش بپا تھی۔ اس کے مذہب میں اس کے اور ڈاکٹر ایڈے می کے لیے ☆ سزائے موت تھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اگر گناہ کا ساتھ اُسے مل جاتا تو زندہ رہنے کی خواہش جیت جاتی اپنے لیے بھی اور اپنے ساتھی کے لیے بھی۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا تھا ربیکا مذہبی عورت ہے، بت پرست نہیں، وہ بے مذہبوں Pagans کے ''جُوجُوز'' پر ہنستی تھی کہ چند بے تکی چیزوں کو جوڑا اور ایک جگہ پر رکھ دیا اور وہ عبادت کی نشانیاں بن گئیں جیسی ہم افریقی دیہاتوں میں دیکھا کرتے تھے اور اپنے مذہب میں، ان کی پرستش کو ☆☆ جنسی بدکاری کی تشبیہ سے بھی آگاہ ہوگی۔ لیکن ان بے معنی پرستش کی چیزوں کی

☆احبار ۲۰: ۲۰، ۱۸۔ ☆☆ یوحنا ۸: ۳، ۷۔

طرح وہ اپنے اس فعل پر ہنس نہیں سکتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا اُن کے ماں باپ کتنے مذہبی آدمی تھے اور اُن سے کیا تعلیم ربیکا کو ملی تھی اور نہ اب میں کریدنا چاہتا تھا کہ اس خود کو ہمہ وقت موت کی سزا کا مستوجب سمجھنے کے پیچھے کیا راز چھپا تھا۔ وہ پورک (سور کا گوشت) کھاتی تھی لیکن وہ تو سب ہی یہودی کھاتے تھے جن سے میں واقف رہا ہوں۔

''ایک عورت نے جو اسرائیل بننے سے پہلے سے یہاں کی تھی ایک دفعہ ایک بات کہی تھی جو اکثر میرے دماغ میں گونجتی ہے۔''

میں نے کہا۔'' کیا؟''

''پہلے ہم خود کو اس ☆زمین کا سمجھتے تھے پھر دوسرے ملکوں سے لوگ یہاں آئے اور ان سے میرے بچوں اور ان کے بچوں نے اس زمین کو ہمارا کہنا سیکھا، ہماری ملکیت۔ مجھے یہ ڈر ہے زمین کی اس بے ادبی کی بنا پر ایک دن، جب وقت بدل جائے گا تو نوآمدوں کے ساتھ ہمیں بھی یہ ملک چھوڑنا پڑے گا۔''

''ایک شامی عورت نے بھی جو بھارت کے شہر کلکتہ میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی تھی یہاں اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھی مگر رہنے کے لیے نہیں، یہی کہا تھا۔

''خود کو یہاں کا سمجھنے اور اُسے ہمارا سمجھنے میں اگر کوئی سوچے تو بڑا فرق ہے۔ خود کو یہاں کا سمجھنے میں یہاں کے پرانے سب لوگ ہیں، ہر طرح کے.....''

میں نے کہا۔'' اور اُن کے ساتھ ہمیشہ سے یہاں کے زیتون اور انجیر اور اوریخ اور رمان (انار) اور عنب (انگور) کے باغات۔''

میرا یہ کہنا اس کے خیال کی رو کو ایک دوسری ہی سمت لے گیا۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ بولی۔'' میں یہ سب پھل تمہارے ساتھ کروں گی آسیہ، ڈن اور زلیخا اور اس تیسری زیڈ کے لیے۔ کیا نام ہے اس کا؟''

☆ خود زمین کے اور تمام زمین والوں کے وارث ہم ہی ہوں گے اور سب لوگ ہماری ہی طرف لوٹا کر لائے جائیں گے/القرآن۔ مریم ۱۹:۴۰

''میں نے کہا۔ زینت۔ ال آل والے یا تو تمہارے اس تحفے کو ملک سے باہر نہیں جانے دیں گے یا ایکسیس بیگج کا چھٹا مجھ پر لگائیں گے۔''

اس نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کہا'' وہ میں دوں گی۔ فکر مت کرو۔''

ہم نے کچھ دیر پھر خریداری کی، میں نے آسیہ اور بچوں کے لیے تحفے خریدے، خاص طور سے آسیہ کے لیے، بیچ بیچ میں وہ تینوں کا حال نام بنام پوچھتی رہی۔ لگتا تھا کوفی کے بعد اس کے دماغ سے مایوسی اور غم کی گھٹا چھٹ گئی ہے۔ پھر اس نے چھیڑنے والے انداز سے کہا، ''تین زیڈ..... ذالنون اور زلیخا کے بعد، لگتا ہے تم نے پیدا ہونے سے پہلے دوسری لڑکی کا نام سوچ رکھا ہوگا..... زینت۔ کیسی نکلی ہے؟ میرے پاس تینوں، سوری چاروں کی موجودہ تصویریں نہیں ہیں، بلکہ تم پانچوں کی۔''

میں نے کہا۔'' اگر معلوم ہوتا تم یہاں بھیڑ میں مجھ سے ٹکرا جاؤ گی (دُنیا بہت چھوٹی جگہ ہے، وہ بیچ میں بول اُٹھی) تو میں پورا البم لیتا آتا۔ رہی میری موجودہ تصویر تو تم میرے سامنے ہو، دیکھ لو۔''

اس نے کہا۔'' آسیہ کیسی لگتی ہے اب؟''

''فرعون کی بیوی؟'' میں نے پوچھا۔

اُسے آسیہ کا نام پہلی بار بتاتے ہوئے میں نے کہا تھا۔'' توریت سے تعلق ہے۔ آسیہ جس نے موسیٰ کو پالا تھا۔''

اُسے وہ بات یاد تھی۔ ہنس پڑی اور بولی تو اس نے تمہیں پالا تھا "You Moses!"

میں نے کہا،'' نہیں! وہ میری بیوی ہے۔''

'' تو پھر تم کون ہوئے؟'' اس نے ہنس کر کہا۔

پھر میں نے چھیڑنے والے انداز سے کہا،'' تم نے میرے خطوں کا جواب دینا کیوں بند کر دیا تھا؟ کیا تمہیں ڈر تھا کہ اُن میں ایک سیفٹی پن جتنا بم چھپا ہوگا؟''

وہ ہنسی نہیں۔ میرا مذاق سفاکانہ تھا جس کا وار ہر آل اسرائیل کے دل پر ہوتا..... مارے

جانے کا خوف..... اور اتنا معصومانہ بھی کہ وہ ٹریولرز چیک لیے کیوں گھوم رہی تھی، نقدی کیوں نہیں؟ کیا اُسے پرس چھیننے والوں کا ڈر تھا اور اتنا ظالمانہ بھی کہ ایک لنگڑے سے پوچھا۔جائے ''تم جیب کترے کے پیچھے کیوں نہیں دوڑے تھے؟''

میرا سوال ایک گزرتے ہوئے زمانے سے متعلق تھا اور قطعاً ذاتی لیکن اس میں چھپی ہوئی بات، جس سے میں کہتے وقت ناواقف تھا، کہ ٹائم بم کا خوف صدیوں کے خوف پر مبنی تھا اور ایک نسل سے متعلق جس کی آئینہ داری شیکسپیئر، گوگول، رچرڈ واگنر (Wagner)، ہائیڈ یگر اور ان گنت ادیبوں، فن کاروں اور مفکروں نے کی ہے، جن سے مغرب نے عشق کرنا سیکھا تھا اور یہودیوں نے ڈرنا اور ان کو رد کرنا۔

اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے بے نیاز رہا۔ میرا خیال تھا اس سوال پر وہ مجھ پر برس پڑے گی۔ جیسے ایک بار جب میں اُسے رمضان کی اہمیت بتا رہا تھا اس نے مُنھ پھٹ طریقے سے کہا تھا ''ایک مہینے بعد اجازت ہے کہ جو چاہو کرو۔'' اس واقعے پر میں چپ رہا تھا اور اس وقت بھی وہ اگر کچھ کہہ گزرتی تو میں چپ رہتا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''چلو دیوار گریہ دیکھ کر آئیں۔''

وہ بولی۔ ''میری شکل کے بعد بھی کسی دیوار گریہ کو دیکھنے کی تمنا ہے؟'' پھر قدرے توقف سے اس نے کہا۔ ''وہاں دیکھنے کا کیا ہے۔ جتنے آنسو لوگ وہاں بہاتے ہیں اس سے زیادہ میں نے چودہ سال کی عمر سے لے کر اب تک بہائے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''چلو چھوڑو'' لیکن میری اندر کی آنکھوں میں ایک کے بعد ایک یروشلم کے ماضی کے خیال آئے..... اس کے پیغمبروں پر ظلم کے اور موجودہ دور میں اس کے چاروں طرف کی زمین پر مسمار کئے جاتے ہوئے لوگوں کے مکانوں اور ان کے اسکولوں اور ہسپتالوں کی عمارتوں کے..... جیسے میرا حافظہ ایک ریموٹ کنٹرول کا سوئچ دبا کر اپنے پروجیکٹر سے میرے ذہن کے اسکرین پر یروشلم کے ماضی کی تصویریں ایک کے بعد ایک لا رہا تھا..... حضرت ذکریا کا اپنی جان سے جانا اور حضرت یحییٰ کا اپنا سر کھونا۔ یہ آج کی عمارتیں کتنے دن کھڑی رہیں گی؟

میں سہم کر رہ گیا۔ بے اختیار میرے مُنھ سے نکلا" ربیکا تم یہاں کی سکونت مت اختیار کرنا۔"

اس نے پوچھا" کیوں؟"

میں نے کہا۔" اس شہر کا ماضی ☆ درد ناک ہے، اور اس کے مستقبل کی پیش گوئی کچھ اچھی نہیں ہے۔"

"تم نے کہاں سے سنا؟"

"سنا نہیں، پڑھا ہے۔"

وہ چپ ہوگئی۔

میں بھی چپ ہوگیا کیونکہ اسرائیل سے متعلق میری معلومات کبھی کبھی مجھے دھوکا بھی دے جاتی ہیں۔ ایک دفعہ خرطوم سے میں نے اپنی ماں کو نیل کی ایک کوڈاکلر تصویر بھیجی تھی، جہاں سفید اور نیلے دریا ایک ہوکر اُم درمان سے شمال کی طرف کا رخ کرتے ہیں۔ میں اور آسیہ اور ذون اس بڑے دریا کے کنارے جزیرہ طوطی کے ساحل پر کھڑے تھے۔ اس تصویر کے پیچھے میں نے لکھا تھا۔" حضرت موسیٰ نے اس دریا کو فرعون کے لشکر سے بچنے کے لیے پار کیا تھا۔"

جواب میں جو ان کا خط آیا اس میں انہوں نے لکھا تھا۔" پیارے بیٹے حضرت موسیٰ نے سمندر کو پار کیا تھا دریا کو نہیں۔"

ربیکا سے اس بحث کو نہ بڑھانے میں میری اپنی مصلحت چھپی تھی۔

☆ اے یروشلم! اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتا اور جو تیرے پاس بھیجے گئے انہیں سنگسار کرتا ہے۔

متی ۲۳:۳۷ Mathew xxiii,37,

Mathew xxiii, 34-35

Thessalonians

-1st Epistle ii,15

Luke xi,51

اس شہر کی عمارتوں اور دیواروں کو گرا دیا جائے گا اور یروشلم غیر قوموں سے جب تک ان کی معیاد پوری نہیں ہوتی پامال ہوتا رہے گا۔ متی ۲۴:۲

مرقس ۱۳:۲، لوقا ۲۱:۲۴

(۹)

ایک بار پھر ہم ایک ریستوران میں بیٹھے تھے۔

ہمارے سامنے زندگی اپنی نورم پر چل رہی تھی۔ یعنی اتنی نارمل تھی جتنی تھوڑے وقفے سے جاگ اٹھنے والے آتش فشاں پہاڑ کی ڈھلانوں پر بسی ہوئی آبادیوں میں ہوسکتی ہے اور جتنی میں دو دن سے دیکھ رہا تھا۔ ربیکا کی طرح جس کا درون بار بار بھڑک اُٹھنے والے جذبات سے کانپ رہا تھا۔ لیکن جو خود کو یقین دلاتی رہی تھی کہ اس کے بچے کا اور اس کا مستقبل پرسکون ہے۔ یہ اس کے لوگوں کا خود کو دلایا ہوا یقین تھا کہ وقت کے دوسرے سرے تک ان کا مستقبل پرسکون ہے۔ وقت کا پہلا سرا وہ تھا جب حضرت نوح کے تین بیٹوں سے دنیا کی تمام نسلوں نے جنم لیا تھا۔ ان تین سے پہلے گویا دنیا میں کچھ بھی نہیں تھا۔

باتوں باتوں میں ایک دفعہ میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں کے خوف کی وجہ سے تو وہ ڈیوڈ کو ہالینڈ چھوڑ کر نہیں آئی ہے۔ لیکن وہ خاموش رہی۔

مرد اور عورتیں جو مشرقی یورپ اور روس سے یہاں آئے تھے ہر دم چوکنے لگتے تھے۔ لگتا تھا کسی بھی گڑبڑ کرنے والے کو زیر کرنے کے لیے ہر دم تیار ہیں۔ عورتوں کے پرس پر مجھے رہ رہ کر شک ہوتا تھا اور ایک ثانیے کے لیے چھاتی میں میرا دل جیسے نچڑ گیا..... اگر اس کے پرس میں بھی کوئی آتشی اسلحہ ہو!

مگر میں نے اسی لمحے دل میں کہا کیا بے وقوفی ہے۔

لیکن مجھے سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کے چہرے کھنچے ہوئے لگ رہے تھے اور سب کے سب جلدی میں تھے۔ میں کتنے ہی عرب ملکوں میں جا چکا ہوں۔ ان میں وہ سکون کہاں تھا وہ لاپرواہی جو میں نے شط العرب کے کنارے پر بسے ہوئے حدیقوں میں میز کے اردگرد بیٹھے ہوئے مردوں میں دیکھی تھی ..... جیسے ان کے پاس کبھی ختم نہ ہونے والا وقت ہو..... بوتل، کوئی میز پر کھیلے جانے والا کھیل اور ایک ہاتھ میں چلتے ہوئے تسبیح کے دانے۔ جیسے سارا وقت ان کے لیے بنا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ حضرت نوح کے کسی چوتھے بیٹے کی اولاد ہوں، جس کا نام بائبل

کے عہد نامہ عتیق میں لکھے جانے سے رہ گیا ہے۔ نہ ہی یہاں لوگ فرانس، برطانیہ اور سوئٹزر لینڈ کے سفید لوگوں کی طرح نظر آتے تھے۔ مستعد لیکن ہمہ وقت پریشان نہیں۔

اس دم یہ ربیکا کے لوگوں کا ملک تھا اور وہ اس کے حاکم تھے لیکن اس وقت کوئی ان سے بھی طاقتور چیز ان پر حکمرانی کر رہی تھی.....خوف اور ایک دوسرے پر بھروسے کی کمی۔ انہیں ہر دم خود کو یقین دلاتے رہنا پڑتا تھا کہ وہ یہاں کے تھے، یہاں سے کبھی رخصت نہ ہونے کے لیے۔ کیوں، بس زمین کے اتنے ہی ٹکڑے کا کیوں، خود کو ساری زمین کا نہیں سمجھ سکتے تھے؟ جس طرح دنیا بھر میں بکھرے ہوئے یہودی (Diaspora) زمین کے اس چھوٹے سے ٹکرے میں کھینچ بلائے گئے تھے اور اس میں سمانے کی کوشش کر رہے تھے میرے تصور سے باہر تھا۔

میں نے ان دو دنوں میں اسرائیلیوں کو ان یہودیوں پر رشک کرتے سنا اور دیکھا تھا جو اس ارضِ موعودہ میں آ کر چند دن ٹھہرتے تھے یہاں کے دیکھنے والے مقامات دیکھتے تھے اور پھر امریکا جانے والے ہوائی جہاز میں یہاں کی نشانیاں لے کر سوار ہو جاتے تھے۔

جو یہودی گورے نہیں تھے زندگی سے بیزار نظر آتے تھے۔ وہ اتنے خوش قسمت نہیں تھے کہ امریکا یا اپنے وطن پُھر سے اُڑ جائیں۔ میرا خیال ہے وہ اپنی قسمت کو روتے ہوں گے کہ کہاں آن چھپے، اپنے ملک میں خوش تھے۔ وہاں ہر دم جان کا کھٹکا تو نہیں تھا۔ پھر آپ کاج مہا کاج۔

میں نے ربیکا سے پوچھا ''یہ سفارڈی (Sephardi) ہیں؟''

اس نے ہنس کر کہا، ''تم بھی یہ ٹرمز سیکھ گئے ہو؟''

میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہا، ''یہاں کی اور دوسرے ملکوں کی زندگی میں تمہیں کوئی واضح فرق نظر آتا ہے؟''

''ایک طرح سے ہاں'' اس نے کہا، ''یہاں ہنگر (بھوک) کی جگہ☆ ہون گھیر نے لے لی ہے.....وہ شاید اتنی شدید نہیں ہوتی ہے۔''

☆Hoon-gehr: Hunger -

میں ہنس پڑا اور میرے منھ سے نکلا،''تم میں چھپی ہوئی اصلی لڑکی کو میں نے اس وقت ڈھونڈ نکالا ہے۔ صبح سے تمہاری تلاش میں تھا۔''

لیکن مجھے ہنسانے میں اس کی ہنسی شامل نہیں ہوئی۔

ہمارے درمیان ایک بے تکی خاموشی اُگ آئی۔

میں اپنے پانی کے گلاس کی گر پر انگلی پھیر کر دیکھنے لگا کون سا سُر نکلتا ہے۔ پھر میں نے ریب کے پانی کا گلاس اٹھالیا۔ اس میں بچا ہوا پانی میرے گلاس سے کم تھا دونوں کی گروں پر انگلیاں پھیرنے سے ایک لے کا سا شائبہ پیدا ہوا۔

وہ کچھ دیر میری انگلیوں کو دیکھتی رہی پھر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

میں نے ایک گلاس پانی اور منگایا اور اس میں تھوڑا پی کر اس کا بھی اضافہ اپنے اورکیسٹرا میں کرلیا۔ لیکن ربیکا کا زیرلب بڑبڑانا میرے کام میں آڑے آرہا تھا۔ میں پوری طرح کوئی دُھن نہیں نکال پارہا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے کہہ رہی تھی۔''کتنے دن میں ان خیالات کا مقابلہ کرتی رہوں گی۔ کتنے دن میں ڈیوڈ کے ساتھ اتنا جھوٹ بولنے کے بعد رہ سکوں گی۔ میں نے اُسے ہر بات غلط بتائی ہے۔ ایک دن اُسے حقیقت کا پتہ چلنا چاہیے۔''

ربیکا فطرتاً ایک ہنسنے ہنسانے والی ہستی تھی اور کبھی اس سے بات کرنے میں لطف آتا تھا۔ لیکن درمیان کے طویل وقفے میں وہ بدل گئی تھی.....ایک غمزدہ عورت۔

''کیا اس حقیقت کی آگہی سے اس کا کچھ بھلا ہوگا؟''

''نہیں۔'' اس نے سر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''اور اگر بتادو تو اس کے بعد؟''

کچھ دیر سوچ کر اس نے کہا،''مجھے اس کا افسوس ہوگا کہ میں نے اس کے اعتقاد کو توڑ دیا جو اُسے مجھ میں تھا۔'' ایک دم سے اس کی آنکھوں میں آنسو پھٹ پڑے اور ایک ہی ثانیے میں اس نے اُن پر قابو پالیا۔ اس کام میں وہ مہارت حاصل کرچکی تھی۔

''تو پھر اس پر اتنا کرم کرو کہ اس تکلیف سے اُسے دور رکھو۔''

میں نے اپنے ایک خط میں جب وہ ناخواستہ اُمید سے تھی لکھا تھا،'' تم نے کہا ہے تم پیدا ہونے والے/والی کو کیسے بتاؤ گی کہ وہ کیوں کر دنیا میں آیا/آئی۔ اس کی پرواہ مت کرو۔ جب وہ تھوڑا بڑا ہو جائے تو اُسے بتانا، تمہارا ایک انکل ہے (یہاں میں نے اس لفظ سے من پسند فائدہ اٹھایا تھا..... پھر پتہ چلتا ہے میں اس کا ماموں ہوں، خالو، پھوپھا یا چچا) اس سے معلوم کر لینا۔ کبھی ملاقات پر وہ تمہیں بتائے گا تمہاری ماں کی کس سے شادی ہوئی تھی اور کس چرچ میں۔ وہ وہاں موجود تھا۔ یہ میرا وعدہ رہا کہ وہ بغیر شادی کے جھنجھٹ کے پیدا ہوا تھا اس کا اُسے کبھی علم نہیں ہوگا۔ اور اگر میں چل بسوں (ان دنوں میری آسیہ کی کھٹ پٹ تھی) تو کوئی اور انکل اس کام کے لیے ڈھونڈ لینا۔

یہ بات میں لکھنے کو تو لکھ گیا تھا لیکن خط پوسٹ کرنے کے بعد خیال آیا شادی کی اہمیت نہ امریکا میں ہے نہ یورپ اور آسٹریلیا میں۔ اس معاملے میں یہودی مغرب کی غیر یہودی دنیا کے فرد ہیں..... نہ کھانے پینے میں بکھیڑا کرتے ہیں نہ ساتھ رہنے کے لیے، شادی کا کھٹ راک مول لیتے ہیں..... سب نہ سہی، اکثر۔

اچانک ایک بار پھر اس نے بولنا شروع کیا۔'' یہ غلطی کا احساس۔ میں ان خیالوں کے سامنے ڈٹ جاتی ہوں۔ وہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں مگر ہر بار فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے واپس آ جاتے ہیں۔ مجھے تو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ کتنی دیر میں اس جنگ کو جاری رکھ سکوں گی۔ یہ اس خدشے سے زیادہ مختلف نہیں ہے جتنا وہاں رہنا جہاں.....''

''کہاں؟'' میں دیکھنا چاہتا تھا کس حد تک وہ اپنی زندگی کے اس دور کی سچائی میں گئی ہے۔ وہ اُس لمحے کی گرفت میں تھی جب ایک شخص سوشل زندگی کی دروغ گوئی، نسلی اور مذہبی تعصبات، اپنے طبقے اور اپنی کمیونٹی کے معیار کے مانگے کے پر نوچ کر پھینک سکتا ہے اور ہر قسم کی نفرت کے خوف سے آزاد ہو کر اپنے لُنڈ مُنڈ عکس کو اگر آئینے میں دیکھے تو خود پر نثار ہو جائے کہ میں اصل میں یہ ہوں اور سر سے پیر تک قابل قبول، کیا اپنی اور کیا دوسروں کی نگاہ میں۔ مجھے کسی مثالی پیکر کی ضرورت نہیں ہے۔

اس نے اپنی بات پوری کی ''اسرائیل میں۔''

''کیسے؟''

''کیسے نہیں ! کب تک؟ کب تک اعصاب خود کو ایک دفاعی جنگ کی ابدی تیاری میں رکھ سکتے ہیں، جھیل سکتے ہیں کہ نہ معلوم کس لمحے جنگ چھڑ جائے۔ میری زندگی ایک مصنوعی زندگی ہے۔ میں خود پر تعجب کرتی ہوں۔ ایک بہت پرانا گناہ اور اپنے کمزور اعصاب سے میں ابھی تک ایک بے معنی جھوڑ میں لگی ہوں۔''

اپنے تمام پچھلے تصادم میں وہ محبت میں ایک حد سے آگے نہیں بڑھی تھی، لیکن اپنے ایما سے بڑھی ضرور تھی اور وہ سب اپنے پیچھے احساس گناہ چھوڑ گئے تھے جن کا تذکرہ وہ اِس اُس سے کر کے انہیں دھوڈالتی رہی تھی۔ لیکن تھے وہ سب تنہائی میں۔ ایڈے یمی سے وہ اس سے زیادہ بڑھی تھی اور اوکنیا کی دنیا اُسے دیکھ رہی تھی۔ جن کے سامنے وہ شرماتی نہیں تھی۔ شوہر اور بیوی کب لوگوں کے سامنے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آبادی میں گھومتے شرماتے ہیں۔ اس لیے جس عذاب سے وہ گزر رہی تھی وہ دغا کا احساس تھا جسے اس نے اپنے ذہن میں وہ گناہ بنا رکھا تھا جو انسان کی تمام گراوٹوں کو ناپنے کا پیمانہ ہے۔

جو بات میں نے اس سے کہی یہ تھی ''ربیکا میں تمہاری اس بے معنی جھوڑ کر سمجھ رہا ہوں۔ کاش اولا ٹو دورا ایڈے یمی، ڈاکٹر ایڈے یمی بھی تمہارے ساتھ اس جھوڑ میں مبتلا ہوتا یا تمہیں پتہ چلے وہ بھی دماغ کی اس خانہ جنگی میں مصروف ہے۔''

میری بات سن کر وہ اس طرح چونکی جیسے کوئی کُھلے ہوئے آسمان کے تلے سو رہا ہو اور بارش کے پہلے چھینٹوں سے جاگ اٹھے۔

میری انگلیوں میں سے میرا سگریٹ لے کر اس نے اپنے ہونٹوں میں رکھا اور ایک اطمینان کا کش لینے کے بعد بولی، ''میں نے تمہاری چھٹی کو خراب کیا۔ نازی گرفت سے بچ نکلنے کے بعد میرا ایک ہی طرزِ زندگی ہونا چاہیے تھا خاموشی اور سکون سے رہنا، ہر قسم کے خرخشے سے دوری۔ لیکن میں نے ایک بار پھر خود کو دن رات کی ایک جنگ میں پھنسالیا ہے۔ میرا خیال ہے

میں احمق ہوں۔"

میرے ذہن میں اس ملک کے لڑکے تھے جو غلیلوں سے ٹینکوں کا نشانہ لیتے ہیں بے خیالی میں میری انگلیاں بھی کچھ کرنے لگیں۔ الٹے ہاتھ کے انگوٹھے اور اشارے کی انگلی کے درمیان پکڑی ہوئی سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو ایک جھٹکے کے ساتھ چھوڑنا۔

"ابھی بدلے نہیں ہو.....ابھی تک کیٹا پلٹ (غلیل) چلاتے ہو۔"

میں نے کہا۔" یہ انسان کی دنیا کا موثر ترین کھیل ہے۔" اور آخری بار اس کھیل کو کھیلتے ہوئے مجھے خیال آیا حقیقت میں میں بچے کھیل رہا تھا۔ لیکن اس کی بات کو میں نے صحیح نہیں کیا۔ اس نے کہا۔" از اٹ؟" (حقیقت میں؟) اور میرے چپ رہنے پر بولی،" ذن کتنا بڑا ہو گیا ہے؟"

"تمہارے ڈیو سے دگنا۔"

ایک بار پھر اس نے نام بنام سب کی خیریت پوچھی، شاید صبح سے تیسری بار۔ میں نے چمڑے کا بٹوا کھول کر بچوں کی ماں کی تصویر دکھائی اور ایک بچوں کا گروپ فوٹو۔ اس نے دونوں تصویریں نکال کر تھینک یو کہا اور اپنے بٹوے میں لگانے لگی۔ پھر ہم نے اپنے اپنے کیمرے سے ایک دوسرے کی ان گنت تصویریں لے ڈالیں۔

اس بار ہم دونوں دل کھول کر ہنسے۔

سڑک پر چلتے ہوئے میں نے کہا،" مجھ سے ملنے سے پہلے تم غمگین نہیں تھیں۔ بغیر چاہے ہوئے میری یہاں موجودگی نے تمہارے سامنے غم کی وادی کو کھول دیا ہے۔"

"مطلب؟"

"پہلے جہاں تم کھڑی تھیں تمہیں معلوم نہیں تھا ایک گہری وادی کے سرہانے کھڑی ہو کیونکہ تمہارے پیروں سے آگے بادلوں کی دھند تھی اور تم خوش تھیں کتنا اچھا منظر ہے۔ میں نے بادلوں کو ہٹا دیا اور تمہارے سامنے وہ بھیانک وادی آ گئی۔ ایک بات بتاؤ تمہارے اندر کی یہ جنگ جس کا تم نے بار بار ذکر کیا کب سے چھڑی ہے؟ جب تم ہالینڈ میں تھیں؟"

''نہیں جب سے نہیں۔ وہاں پہلے صرف یہ فکر تھی ڈاکٹر ایڈے یمی دنیا کے کس کونے میں چھپا ہے۔ جیسے اگر میں اُسے پالوں تو وہ پھر مجھ سے محبت کرنے لگے گا (میں بول اٹھا: مجھ سے معافی مانگے گا، روئے گا، میرے پیروں پڑے گا) پھر ان خیالات کی جگہ نفرت اور انتقام کے جذبات نے لے لی (میں نے کہا: خوش قسمت تھا اس زمانے میں تم سے بچ گیا) اور جب وہ بھی رخصت ہوگئے تو میں ڈیوڈ کی اور اپنی زندگی کی فکروں میں گھر گئی۔ ڈیو کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال..... ٹیکے، صحت، خوراک، پوشش، تعلیم، اس کو تفریح گاہوں میں لے جانا..... زُو اور میوزیم، کتنی بار تو اس کے اصرار پر میں میڈیورو ڈیم گئی ہوں بچوں کا شہر، غرض کہ وہ تمام مراحل جن سے تم تین تین بار گزرتے ہو۔''

''پھر میں نے یہاں آ کر سیٹل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔''

''وہاں سیٹلڈ نہیں تھیں؟''

''بہت سی وجوہات..... کچھ عقل پر مبنی تھیں کچھ جذبات پر، جب اس ملک کو چھوڑ کر یہاں آ کر رہنے کا فیصلہ کیا تو دل کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔''

میں نے واعظ بنتے ہوئے کہا، ''ربیکا جس ملک نے تمہیں پناہ دی تھی اس کی ہوکر رہو۔''

''اور تم بھی۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں میں بھی کوشش کروں گا۔''

اچانک اوزی کے چلنے کی آواز ایک سمت سے آئی اور کسی عورت کے چیخ مار کر مرجانے کی۔ یا ہوسکتا ہے مجھے لگا ہو مرجانے کی آواز ہے۔

میرے اسرائیل پہنچنے والے دن حیفا میں ایک بم ایک ریستوران کے دروازے پر پھٹ چکا تھا اور بھی کئی جگہ پر دھماکے ہوئے تھے۔ ان میں دو اشک نازی☆ (سفید) ایک ایتھوپیا کا اسرائیلی مرے تھے۔

ربیکا نے کہا، ''عورت کی آواز تھی۔ میں اُسے پہچاننے میں دھوکا نہیں کھا سکتی۔''

☆ شمالی اور مشرقی یورپ کا یہودی (Ashkenaz Gen 10:3) Ashkenazi۔

''بہت عورتیں مرتی دیکھی ہیں تم نے؟''

''کچھ ۱۹۴۰ء میں کچھ اب۔''

اس کا چہرہ جو چند لمحوں پہلے اپنے بیٹے کا ذکر کرتے ہوئے خوشی سے بھرا تھا پیلا پڑ گیا۔

''کسی فلسطینی کا کام ہے، اتنا ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جو چیز ہاتھ سے نکل گئی ہے واپس نہیں آ سکتی ہے۔ اِڈیٹ لوگ ہیں، بے مصرف'' وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔

میں خاموش رہا۔ اُس میں چھپی ہوئی عورت کو میں نے صبح سے تھوڑی دیر کے لیے دیکھا تھا اور اس وقت جو میرے سامنے کھڑی تھی بالکل دوسری عورت تھی۔

دکاندار دکانوں کے باہر نکل آئے تھے اور جو جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ ہم دونوں کے قدم بھی جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے۔ ایک سپاہی نے آ کر اس سے کچھ یدش میں کہا۔ پھر مجھ سے پوچھا۔ میں کون ہوں۔ میں نے کہا، ''ایک برٹش ڈاکٹر۔ سرجن۔''

ربیکا نے جیسے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے نام بتایا اور اس کے آخر میں ولسن لگا دیا۔

ایک دم پھر سب لوگ چلنے لگے جس طرح سائلنٹ دور کی فلموں میں ہوتا تھا ایک دم رُکے، ایک دم تیزی سے چل پڑے، مشینیں.....دکاندار اور ان کے گاہک اندر چلے گئے۔ سپاہی بھی میرے سامنے سے ٹل گیا۔

آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر سے طیش کی سرخی اترتی گئی اور جسم کا ہلنا تھم گیا۔

سورج سر پر سے کبھی کا گذر چکا تھا اور مجھے بھوک لگ رہی تھی میں نے کہا، ''ربیکا اپنے گھر کھانے پر نہیں بلاؤ گی؟'' وہ چپ رہی۔

''موم بتیوں کی روشنی میں کھانا، گنی فاؤل کا روسٹ، بیرا کوڈا بھاپ کی پکی، انگور کا جوس۔ تمہیں معلوم ہے میں پیتا نہیں ہوں۔ اس کے بعد اپنا گھر دکھانا اور پھر.....''

''سونے کا کمرہ'' اس نے بے ساختہ ہنس کر کہا۔ ''یو نوٹی بوائے۔ آسیہ میری دوست ہے۔ تم اُسے دھوکا دے سکتے ہو، میں نہیں دے سکتی۔''

''اور میں صرف کوشر گوشت کھاتا ہوں، مچھلی بھی کوشر سمجھیں، نہ پورک، نہ☆ لارڈ میں تلی ہوئی کوئی چیز۔''

اس نے کہا،''میں تمہیں بلا کب رہی ہوں۔ میں تو خود کسی کی مہمان ہوں۔''

''اور ڈیوڈ؟''

وہ ہالینڈ میں کسی کا مہمان ہے۔''

میں نے کہا۔''مجھے اکثر وہ دن یاد آتا ہے جب ایلف اور جینٹ اپنے کتے کو تمہارے سپرد کر کے گووا گئے تھے یا پرتگال اور تم نے اس کے لیے ایک سور کے گوشت کا ٹن کھولا تھا اور کئی بار اُسے سونگھنے کے بعد مجھ سے اُسے سونگھنے کے لیے کہہ رہی تھیں کہ''دیکھو بُس تو نہیں گیا ہے۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوں کہ اسے کرک (kirk) کو دوں یا نہیں چکھ کر بتاؤ۔ میں نے کہا تھا۔''میں مسلم ہوں سور کا گوشت نہیں کھاتا ہوں۔'' اور تم نے کہا تھا۔''میں کھانے کے لیے کب کہہ رہی ہوں صرف چکھ کر بتادو'' یہ واقعہ میں اپنے بہت سے مسلمان دوستوں کو سنا چکا ہوں۔ سب تمہاری سادہ لوحی پر ہنستے ہیں۔''

وہ بھی ہنس پڑی۔

کھانا ختم ہو چکا تھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے افریقی ڈرم میز پر بجانا شروع کیا اور ایک ☆☆ایبو گانا گانے لگا جو ان دنوں نائیجریا میں اکثر سنائی دیتا تھا جب وہ بھی وہاں تھی اور ہم بھی۔

بنے بنے وائیا ہو، بنے بنے وائیا

وائیا ہو، وائیا ہو

پتہ نہیں ان لفظوں کے کیا معنی تھے۔ وہ ہنس پڑی اور بولی۔

''او یو اٹرنل چائلڈ۔ ابھی تک تمہیں یاد ہے۔''

☆ سور کی چربی تلنے کے کام کی

☆☆ نائیجریا کے جنوب مشرق کے لوگ۔

(۱۰)

اب یہ مجھے یاد نہیں ہے آخری بار اس شہر میں ٹہلتے ٹہلتے تھک کر ہم کہاں بیٹھے تھے۔ یعنی کس ریستوران میں کس سڑک پر۔

میں نے اس سے پوچھا۔"ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں بیٹھ کر ہم ایک ریفر (چرس بھرا سگریٹ) پی سکیں؟"

اس نے سر گھما کر میری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور ایک سامنے سے تیزی سے آتے ہوئے راہ گیر سے ٹکرا گئی۔ اس کے منھ سے بیک وقت "باہ۔ ڈا۔ یہرن "bah-Daw-yeh-rin" اور" کیا تم جوان ہوتے جا رہے ہو؟" نکلا۔

راہ گیر نے رک کر اس کی طرف گھور کر دیکھا، کچھ یدش میں کہا اور اپنا چشمہ درست کرتا ہوا تیزی سے چل پڑا۔

"نہیں میں تمہیں ذرا خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"وہ ناممکن ہے، سوال وہی اب بھی ہے جب سے ہے جب ڈیوڈ نے میری باتوں کو سمجھنا شروع کیا تھا اور اپنے باپ کے بارے میں پوچھنا اور جب اپنے رنگ کا مجھ سے مختلف ہونے کا اُسے احساس ہونے لگا تھا۔ ایک دن اس نے اسکول سے آکر مجھ سے پوچھا تھا" یہ ایڈیے کون شخص ہے۔ کسی بچے کے باپ کا ایسا نام نہیں ہے۔"

(Who is this guy Adeyemay? No one at school has father with that name)

"کب تک میں اس اذیت کو جھیل سکتی ہوں۔"

"ضروری تو نہیں کہ تم ان خیالات کے ساتھ ساتھ سکون سے رہنے کی سوچو۔"

"پھر؟"

"انہیں غلط اور بے مقصد سمجھ کر اُن سے بے اعتنائی برتو۔"

''تمہارا خیال ہے میں ایسا کرسکتی ہوں؟ خیال غلط نہیں ہیں، صرف مجھے تھکا جاتے ہیں۔''

میں نے کہا،'' یہ قصور تمہاری پرورش کا ہے۔''

''میری کوئی پرورش نہیں ہوئی تھی۔ میں بس بڑی ہوگئی۔''

میں نے کہا۔'' مذہبی تعلیم ایسی دوا ہے جس کی خوراک مقرر کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ یا ایسی سمجھو جس کی بے ضرر اور مہلک خوراکوں کے مابین بہت تھوڑا سا فرق ہے.....ذرا زیادہ اور مریض کی ہار، ذرا سی کم اور مرض کی جے کار۔ بدقسمتی سے تمہارے حقیقی اور پرورش کرنے والے ماں باپ، کلیسہ کے پادریوں اور کنیس(Synagogue) کے ربائیوں نے تمہیں مذہب کی تقریباً مہلک خوراک پر پالا تھا۔ جس ایمان سے تم خوف زدہ ہوکر چپٹی رہی ہو وہ تمہیں کشتی کے پتوار کی طرح راستے سے نہ ادھر جانے دیتا ہے نہ اُدھر۔ خواہ زندگی کا دھارا کسی سمت ہو۔ مائی ڈیئر گرل فروم بیرشیبا تم کیسے اپنے اندر کے مطالبات کو سدا خاموش رکھ سکتی تھیں۔ اخلاق نہ ہوا، ڈکٹیٹر شپ ہوئی۔''

''نہیں میں نہیں رکھ سکتی تھی۔'' اس نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

''اتنا سمجھنے پر بھی اگر سزا کی طلب گار ہو، اگر مذہب سے کوئی ڈھارس بندھانے والا پیغام نہ ملے، نہ شراب ساتھ دے سکے تو خودکشی ہی ذریعہ نجات رہ جاتا ہے۔''

''تم مجھے چرس پینے اور خودکشی کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔''

''نہ، نہ، نہ'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔'' میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں۔ اپنی ماں کے سکھائے ہوئے طور طریقوں پر قائم۔ وہ مجھے اچھی فکشن بھی سناتی تھیں اور اچھی فلموں میں بھی لے جاتی تھیں۔ اس لیے زندگی بسر کرنے کے بارے میں میرے اپنے اصول ہیں، عائلی زندگی کے بارے میں میرے اپنے نظریے۔ میں نارکوٹکس کنٹرول کے بھی خلاف ہوں۔ کہتا آیا ہوں ہر شہر میں ٹھیکے کھول دو جیسے برٹش راج میں اور اس سے پہلے ہمارے یہاں تھے۔ جہاں سے جس کا جی چاہے ہیروئن خریدے، چرس، افیون یا شراب۔ ایک طرح کے نارکوٹکس کے شاپنگ

مال۔ اس ٹریڈ سے جرم ختم ہوجائے گا۔ جنہیں نشہ کرنا ہے وہ ابھی کرتے ہیں۔ جب بھی کریں گے۔ نفع بٹورنے والوں کا خاتمہ ہوجائے گا اور جرم سے تہی ہوکر نشے اپنی تین چوتھائی لبھاوٹ کھو بیٹھیں گے۔ اسی طرح سو پچھتر سال پہلے کی دنیا میں تھا۔ اور اس زمانے میں فیصد، فیصد بہت کم لوگ نشہ کرتے تھے۔

''اس ملک میں بھی پُرانوں میں سے جس کا جی چاہے رہے اور نئوں میں سے بھی جس کا جی چاہے رہے، جس کا جی نہ چاہے نہ رہے (وہ بولی: جیسے تم بریٹین میں) کتنے اور ملک پڑے ہیں۔ جنگی ہتھیاروں کی تجارت بیٹھ جائے گی اور جنگ کی لبھاوٹ بھی۔ تم بھی اپنے دل کو آزادی دو۔

''جتنے اپنی زندگی کے چھپانے والے واقعات یا حادثات تم نے مجھے سنائے تھے میں جانتا ہوں ان میں تم اپنے مذہبی حدود میں رہی تھیں۔ صرف اولا ٹو وڈ اور ایڈ ے می کے معاملے میں تم نے پابندی کی لائن کو پار کیا تھا اور اس کی وجہ میں سمجھتا ہوں یہ تھی کہ تم اندر سے آگاہ تھیں کہ ماں بننے کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے، یا ابھی ہے؟''

''ختم ہوگیا۔''

''اس کے آگے تم اپنے جسم کے ایک حصے کو جو تم سے علیحدہ بھی ہو اور تمہارا بھی، نہ دیکھ سکو گی (اس نے اطمینان کا سانس لیا) جنٹ والا دور، اور عورت پر وہ دور سخت ہوتا ہے جس کے بچہ اس وقت تک نہ ہوا ہو وہ ایک طرح کی جلدی میں ہوتی ہے کہ کیا زیست سے تعلق بغیر اُسے آگے لے جائے منقطع ہوجائے گا۔ اور آج تک اس biological urge کی سزا خود کو دے رہی ہو۔ جو سزا تمہارا ضمیر تمہارے لیے تجویز کر رہا ہے وہ تم خود کو نہیں دے سکتی ہو کیونکہ اس کا زمانہ گزر چکا ہے۔ پھر وہ سزا دونوں کے لیے تھی لیکن اس گناہ میں شریک تمہارا ساتھی کہاں ہے؟ ویسے بھی وہ کرسچین تھا۔ وہ کیوں خود کو اس سزا کے بھگتنے کے لیے راضی کرنے اور اپنا سر پھٹوانے لگا اور تم بھی اس گناہ کے بعد جب تم گل مہر سرخ کچی مٹی کی اسٹریٹ پر اس کا ہاتھ میں ہاتھ تھامے، یا ڈپارٹمنٹ کی مٹر بوٹ میں نیجر کے پار جاتی ہوگی۔ یہودی کہاں رہیں!'' وہ چونکی۔

اس لیے کہ تمہارے ہاں تو اسے بت پرستی کے گناہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ تم ☆ بت پرست ہو گئیں۔ سو مائی ڈیئر گرل فرام ہیرشیبا فورگیٹ اباؤٹ دی ہول تھینگ۔

''ایک بات بتاؤں اگر ایڈے یمی تم سے دغا نہ کرتا اور وہ سزائیں اس سرخوشی میں گم ہو جاتیں جو تمہیں اس کے ساتھ تاعمر رشتے میں ملتی، چاہے اس کی اکیلی ہو کر چاہے ایک سوتن کے ساتھ۔''

''پھر کیا ہوتا؟''

''ایک گھر، بہت سے کمرے۔ ایک تمہارا، ایک سوتن کا۔''

''اور؟''

''اس کے ساتھ تم بھی یام کیک (yam cake) بنایا کرتیں اور مرچوں کا سرخ سالن۔ کھانے میں کبھی گلہری کا گوشت ہوتا، کبھی جنگلی چوہے کا (اس نے اُغ کی آواز نکالی) اور پیٹھ پر ڈیوڈ یا اس کی چھوٹی بہن کو باندھے لوکل مارکیٹ (قصباتی ہفتہ وار پینٹھ) میں سالن میں ڈالنے کو جمے ہوئے خون کا کیک خرید رہی ہوتیں یا سور کی تھوتڑی کی گلابی کھال'' اس نے پھر اُغ کیا اور بولی۔

''تمہیں یقین ہے؟''

''مجھے یقین ہے۔ ہو سکتا ہے ایک سوتن نہ ہوتی ان کی درجن بھر فوج ہوتی۔ آؤ۔ آسیہ کے لیے تحفہ پسند کرنے میں میری مدد کرو۔ ہماری شادی بوسیدہ ہو گئی تھی۔ اب پھر اس میں جان پڑی ہے۔''

راہ چلتے ہوئے میں نے کہا، ''تم رامائن سے آگاہ ہو؟''

اس نے کہا، ''تھوڑی۔ تھوڑی۔''

''کتنی؟''

''بس اتنی کہ گوڈیس سیتا کو ڈیمن کنگ راون اٹھا کر لے گیا تھا اور بھارت کی سیلون

☆ یوحنا ۸:۳۔۷، احبار ۲۰: ۲۰۔۱۸۔

سے جنگ چھڑ گئی تھی۔''

میں نے کہا،'' پھر تم نے کچھ بھی نہیں پڑھا ہے۔ وہ کہانی یوں ہے۔ رام نے اپنی سوتیلی ماں کو خوش کرنے کے لیے اپنی راجدھانی چھوڑی تھی جوان کے باپ نہیں چاہتے تھے کیونکہ اپنے سب سے بڑے بیٹے رام کو وہ اپنا جانشین چھوڑنا چاہتے تھے..... ایودھیا کا راجہ۔ سوتیلی ماں یہ نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے بھرت کو تخت دلوانا چاہتی تھی۔''

(وہ دلچسپی سے کہانی سننے لگی جیسے میرے ساتھ کار میں برابر کی سیٹ پر بیٹھی ہو۔)

'' پھر کہانی میں وہ سین آیا کہ رام اور لکشمن شکار پر گئے ہوئے تھے اور جاتے ہوئے رام چندر کٹیا کے باہر ایک حصار کھینچ گئے تھے جس کے اندر سیتا کا دنیا کی کوئی طاقت کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی، بشرطیکہ وہ خود اس کے اندر رہتیں۔

راون فقیر کا بھیس بدل کر دکشنا لینے آیا اور حصار کے باہر معذور بن کر بیٹھ رہا، یا تھکن ظاہر کر کے گر پڑا ہوگا۔

سیتا نے حصار کے باہر بھیک دینے کو قدم رکھا اور وہ انہیں اڑا کر لنکا لے گیا۔ لنکا شائد نہیں۔''

وہ چونک پڑی'' کچھ میری سی کہانی ہے۔''

اور جب آخری حصہ میں نے سنایا کہ ایک دھوبی کے البنے پر انہوں نے سیتا کو گھر سے نکال دیا کہ وہ غیر کے گھر رہی تھی، تو وہ رونے لگی۔

بولی'' پھر؟''

'' پھر کیا کہانی تھی، ختم ہوئی۔''

(۱۱)

اس ملاقات کو تیس سال گزر چکے ہیں۔ نہ ہی اس نے خط لکھا نہ ہی کسی اور ذریعے سے مجھے معلوم ہوا وہ کہاں ہے۔ ڈیوڈ کا کیا ہوا۔ ہالینڈ میں ہے یا افریقہ اپنے باپ، دادا، پردادا کی کھوج میں چلا گیا جہاں اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہوگا۔ آخر کو اس میں سفید رنگ کی رمق تھی۔

ہوسکتا ہے اسرائیل میں ہو۔ یہ بھی ممکن ہے امریکا میں ہو۔ میرا جی یہ ماننے کو تیار نہیں ہے کہ وہ مارا گیا ہوگا اور بہت سے فلسطینی اس کے ہاتھ سے مارے گئے ہوں گے۔

میرے عمر رسیدہ یہودی واقف کسی ملک میں مرکھپ گئے ہوں گے اور نوجوان دل ماننے کو تیار نہیں ہے اسرائیل میں مارے گئے ہوں گے اور ان گنت عربوں کا خون ان کی گردن پر ہوگا۔

رہی ربیکا، وہ اسرائیل سکون کی تلاش میں گئی تھی۔ وہاں لوگوں کے مکانوں کو ملبہ بنتے اور ان کی مرتے دم کی چیخ سن کر وہ کب تک کہتی رہتی کہ آخر کو یہ لوگ کیوں نہیں سمجھ لیتے ہیں کہ جو چیز ہاتھ سے نکل چکی ہے دوبارہ نہیں ملا کرتی۔ وہ ایک جڑ سے اکھڑا ہوا پودا تھی جسے سورج کی کرنیں پڑنے سے پہلے ہی زمین میں لگادیا جانا چاہیے تھا۔ اس میں دیر ہوئی۔ ہوسکتا ہے وہ پودا مرجھا گیا ہو۔

میرے پاس ابھی تک اس کا وہ عورتوں کا مختصر سا بےمصرف رومال ہے جو اکثر خود ان کے آنسو خشک کرنے کے لیے بھی ناکافی ہوتا ہے۔ اس پر اس نے میرے اصرار پر اپنے بال پوائنٹ پین سے اپنا پتہ لکھا تھا، اپنا مستقل پتہ۔

جب وہ رومال اس کے سامنے سے اٹھا کر میں نے اس پر لکھی ہوئی عبارت پڑھی تو اس پر اس ریستوران کا نام لکھا تھا جس میں ہم اس وقت بیٹھے تھے اور اس سڑک کا نام جس پر وہ ریستوران تھا۔

اس پتے کو پڑھنے کے بعد میں نے مزید اصرار نہیں کیا تھا کہ یہ کیا مذاق ہے۔ صحیح پتہ لکھو۔

میرا پتہ اس کے پاس تھا۔

آخری لمحوں میں اس نے کہا تھا ”میرا خیال ہے وہ بوجھ بہت کچھ میرے سر سے اتر گیا ہے۔“

”کیسے؟“

"سزاؤں کا دور گزر گیا ہے۔ زندہ رہنے کا دور ہے۔"

میں نے کہا تھا۔ "میرے سر پر سے بھی وہ بوجھ اتر گیا ہے جسے میں لاد کر یہاں لایا تھا۔ سروں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اچھی زمین ہے۔"

کیا حرج ہے اگر وہ بھی زمین پر بکھرے ہوئے یہودیوں (diaspora) میں سے ایک ہوگئی ہو۔ تمام دوسرے مذاہب والوں کی طرح۔ She was a Wandering Jew اور مجھے اس کا وہی روپ پسند ہے۔

ماں بیٹی

ماں بیٹی

۱

آمنہ کا دوسرا نام کلیرس☆ ہے لیکن اسے اس نام سے ایک محدود حلقے کے سوا کہیں اور نہیں جانا جاتا ہے۔ صومیہ کا بھی ایک دوسرا نام ہے، جورجیانا لیکن اسے بھی اس دوسرے نام سے صرف وہی لوگ جانتے ہیں جو آمنہ کا ذکر کلیرس کہہ کر کرتے ہیں۔ گھر پر جورجیانا آمنہ کو مما کہتی ہے لیکن دوسرے ملنے والوں کے سامنے امی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الفت کی حد تک پیار ہے۔

تیسرے پہر دروازے پر کھٹکا ہوا یعنی کچے صحن کے دوسرے سرے پر۔ کمرے میں جورجیانا نے کلیرس کو دیکھا اور کرسی سے اٹھنے ہی والی تھی کہ کلیرس نے کہا، ''تم پڑھو میں جا کر دیکھتی ہوں۔''

جورجیانا شاید اسلامک اسٹیڈیز کی کتاب کھولے بیٹھی تھی جس میں اسے مطلق دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے پھٹاکے سے کتاب بند کی اور اسے میز پر تقریباً پٹختے ہوئے بولی، ''نہیں مما، آپ

☆Clarice

آرام کیجیے میں جا کر دیکھتی ہوں۔"

کلیرس کو ہر آنے والے کے لیے بٹی کا دروازے پر جانا اور پوچھنا "کون ہے؟" پسند نہیں تھا۔ لیکن اپنے جوڑوں کا درد اس سے بھی زیادہ ناپسند تھا۔ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ جورجیانا کسی مرد سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر دروازہ بند ہوا اور دونوں کی آوازیں صحن میں نزدیک آ کر ختم ہو گئیں۔ لمحے بھر بعد جورجیانا کی آواز آئی، "امی خالو آئے ہیں۔"

کلیرس اٹھ کھڑی ہوئی اور ساڑی درست کرتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔ صحن میں جہاں بیری تھی، خالو بائیسکل پکڑے کھڑے تھے اور اس کی چین جورجیانا چڑھا رہی تھی۔ خالو نے کلیرس کا سلام علیکم تو سنا نہیں مسکرا کر بولے، "ٹھیک ہوں۔ یہاں پاس ہی چین اتر گئی۔ میں اسے چڑھانے کے لیے جھکا تو صومیہ مجھے ہٹا کر خود چین چڑھانے لگی۔" ان کے چہرے کی مسکراہٹ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سنتے کم ہیں۔

ایک بار پھر آمنہ نے سلام علیکم کہا اور پوچھا، "اس وقت کیسے آنا ہوا؟"

وہ جواب میں صرف ہنس دیے۔

صومیہ نے بائیسکل کو ان کے ہاتھ سے لے کر بیری سے لگا کر کھڑا کیا اور تیل ملی ہوئی سیاہی کو اپنے ہاتھوں پر دیکھتی ہوئی غسل خانے میں چلی گئی۔

خالو پھر شرمندہ سی ہنسی ہنسے اور آمنہ سے بولے، "میں نے تو بہت منع کیا لیکن اس نے سنا ہی نہیں۔"

آمنہ نے کہا، "کوئی بات نہیں" پھر ان کے نزدیک جا کر اپنا سوال دہرایا، "اس وقت کیسے آ گئے؟ یہ تو اوفس کا وقت ہے۔"

"آج عید میلاد النبی کی چھٹی ہے..." کلیرس خجل ہو گئی، اتنی اہم بات وہ کیسے بھول گئی تھی۔ "اور مجھے شمیمہ نے بھیجا ہے کہ تمھیں میلاد شریف کا بلاوا دے آؤں۔"

شمیمہ ان کی بٹی کا نام تھا۔ "اور گھر میں سے انھوں نے بھی کہلوایا ہے کہ ضرور آنا ہے، عصر کے بعد ہوگا اور رات کا کھانا بھی ہے، مغرب کے بعد۔"

آمنہ چونک اٹھی، "اتنے شورٹ نوٹس پر!"

خالو نے کہا، ''میں نے بھی یہی کہا تھا۔ بس اچانک دونوں کا پروگرام بن گیا۔ میں نماز پڑھوں گا۔'' انھوں نے کرتے کی آستینیں چڑھاتے ہوئے کہا۔

اس اثنا میں صومیہ کچن سے ایک ڈسٹر لاکر سائیکل کے ہینڈل اور فریم کو پونچھ چکی تھی، خالو کی بات سن کر بھاگی ہوئی اندر گئی، آمنہ خالو کو غسل خانے کے دروازے تک لے گئی اور جب وہ وضو کر کے باہر نکلے تو انھوں نے دیکھا برآمدے میں صومیہ جانماز بچھا کر اس کے بیروں والے حصے کی طرف کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں ان کے لیے صاف تولیہ تھا۔

خالو ظہر کی نماز آج دیر سے پڑھ رہے تھے۔ عصر کی اذان میں زیادہ وقت نہیں تھا۔

چائے کے بعد خالو تو چلے گئے لیکن کلیرس اور جورجیانا سوچنے لگیں اتنی جلدی کیسے تیار ہوا جا سکتا ہے اور یہ کہ بہ ہرحال جانا تو تھا۔ یہ منھ بولی خالہ اور ان کا گھرانا آمنہ اور صومیہ سے بے انتہا محبت کرتا تھا اور اگر ان کے گھر بھی نہ جایا جائے تو اس شہر میں کتنے اور رشتے داروں کے گھر تھے جہاں آنا جانا ہوتا۔ ملنے والے جورجیانا کے بھی تھے اور کلیرس کے بھی۔ دونوں خوب صورت تھیں اور دونوں کی رنگت وہ تھی جو کبھی پیور بریڈ گھرانوں کی عورتوں میں دیکھنے میں نہیں آتی ہے۔ نہ دودھ کی طرح سفید، نہ سینبھل کے پھولوں کی طرح گلابی۔ اوف وھائٹ کہنے سے شاید بات بن جائے۔ آنکھیں نیلی نہیں تھیں، سیاہ تھیں۔ بال سیاہ نہیں تھے، سنہری تھے۔ ماں کے زیادہ، بیٹی کے کم اور دونوں کے نقوش ایک جیسے تھے۔ صرف یہ کہ کلیرس کا چہرہ وقت کے ساتھ جبڑوں پر تھوڑا چوڑا ہو گیا تھا اور جورجیانا کا چہرہ جوانی کی ضرورت تک محدود تھا، نہ کہیں سے چوڑا نہ ٹھوڑی کے نیچے کوئی عمر کا دیا ہوا اضافی گوشت جو گردن کو چھپا دے۔ دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر ہر کوئی کہہ سکتا تھا وہ آمنہ بارہ سال پہلے کی ہے اور یہ اب کی۔ یا یہ کہ یہ صومیہ اب کی ہے، وہ آنے والے بارہ سال بعد کی۔

تیار ہونے میں دونوں کو خاصا وقت لگا کیوں کہ واقعی چھٹی ہونے کی وجہ سے نہ صبح سے جورجیانا نے نہا دھو کر کنگھا کیا تھا نہ اپنی واحد لپ اسٹک کو اپنے ہونٹوں کو چھونے دیا تھا۔ چائے روز کی طرح جورجیانا نے بنائی تھی لیکن دس بجے۔ ناشتے کے بعد کلیرس آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی تھی اور جورجیانا نے کیمسٹری کے نوٹس مکمل کیے، کچھ وقت فزکس کو دیا اور تنگ آ کر بستر پر

لیٹ کر نوول جسے وہ ہفتے بھر سے پڑھ رہی تھی اور چند صفحوں سے آگے بڑھ نہیں پائی تھی، پڑھ پڑھ کر جھپکیاں لینے لگی۔

پھر وہ اٹھ کر باہر گئی اور آ کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر امرود کھانے لگی۔ اس نے پوچھا، ''مما! ہم اس وقت بات کر سکتے ہیں؟''

کلیرس نے کہا، ''اس وقت نہیں مائی لو۔'' (My love)

''امرود کھائیں گی؟ دوں؟''

کلیرس نے کہا، ''اس وقت نہیں مائی ڈارلنگ۔''

''کیوں؟''

''میرے سر میں درد ہے۔''

''دباؤں؟ کوفی بنا دوں؟ پاراسیٹمول☆ دوں؟'' تینوں باتوں پر کلیرس کا سر دائیں بائیں ہلتا گیا۔

''آپ کی مرضی۔''

۲

میلاد میں شرکت اچھی بلکہ بہت اچھی رہی۔ کچھ جانی پہچانی شکلیں تھیں، زیادہ تر نئی۔ میلاد پڑھنے والی ایک بوڑھی ہوتی ہوئی خاتون تھیں جنھوں نے خواتین اور بچوں کو اپنے لیکچر میں موت اور قبر کے عذاب سے ڈرانے کی کافی کوشش کی لیکن جو لڑکیاں ان باتوں سے کل ڈرتی تھیں آج ادھیڑ عمر کو پہنچ رہی تھیں۔ جوان لڑکیوں اور عورتوں کا دماغ کہیں اور تھا۔ ان کی کھس پھس پر مقررہ نے چڑ کر کہا، ''نکل جائے محفل سے جو بے ادب ہو۔''

رفلیکس ایکشن☆☆ کی طرح اونگھتی ہوئی ادھیڑ عمر کی عورتیں ''اٹھو تا کہ تعظیمِ محبوبِ رب ہو'' کہتی ہوئی کھڑی ہونے لگیں کہ شاید اب سلام پڑھا جائے گا۔ میلاد پڑھنے والی کے ہاتھ کے اشارے سے سب بیٹھ گئیں۔ لڑکیاں چہروں کو دوپٹوں سے چھپا کر ہنسنے لگیں۔

لیکچر کے بعد نعتیں پڑھی گئیں۔ پڑھنے والی لڑکیاں تھیں جو لپ اسٹک، روژ اور پرفیوم

---

paracetemol☆

reflex action☆☆

سے مسلح ہو کر آئی تھیں۔ وہ جو کچھ پڑھ رہی تھیں شاعری کے اعتبار سے اعلیٰ معیار کا نہ سہی موسیقیت کے اعتبار سے یقیناً اعلیٰ معیار کا تھا۔ بغیر جانے ہوئے کوئی نعت درباری میں پڑھ رہی تھی کوئی کیدارا میں اور بعضوں کی دھن مکمل طور پر پنج میل فلمی تھی۔ ان میں ایک لڑکی، صومیہ کو تعجب ہوا کولج میں اس سے صرف ایک سال آگے تھی۔ اس کی زندگی کے اس رخ کا صومیہ کو علم نہیں تھا اور سنا جاتا تھا سب پڑھنے والیوں، خوش الحانیوں کو کافی رقم بطور نذر ملتی تھی۔ لیکن خالہ کے گھران کے سامنے وہ عقیدت سے حمد اور نعت پڑھنے آئی تھیں۔

اپنے گھر میں جیور جیانا بھی گاتی تھی لیکن انگلش گانے، یا کبھی کبھی وہ گانے اس کے منھ سے نکلنے لگتے تھے جن کا سڑکوں پر ان دنوں زور ہوتا تھا۔ اسے اکثر اپنی زندگی میں ایک پیانو کی کمی محسوس ہوتی تھی اور تلخی سے سوچتی تھی، کاش مما نے زندگی نہ بدلی ہوتی تو میں چرچ میں پیانو بجانا سیکھ سکتی تھی۔

پر زندگی تو یہ تھی کہ گھر میں کوئی معمولی سا بھی میوزیکل انسٹرومنٹ نہیں تھا۔ اسے ہائی اسکول کے امتحان میں اعلیٰ کامیابی پر اسکولرشپ کی جو رقم ملی وہ اتنی تھی کہ پیانو نہ سہی وائیلن تو وہ خرید ہی سکتی تھی۔ لیکن اس خواہش پر مما نے کہا تھا، ''تمھیں پتا ہے ہم اس علاقے میں خاموشی سے رہ رہے ہیں، سب جانتے ہیں ماں بیٹی ہیں، مرحوم پپا کی پینشن پر جی رہے ہیں۔ بمشکل گزران کرتے ہیں۔ میں تمھیں مختلف کام کر کے پڑھا رہی ہوں۔ پھر ایک مسلم گھرانے میں پیانو یا وائیلن کا کیا کام۔ جنھیں آج ہم میں دلچسپی نہیں ہے، کل گھر سے نکلنے والی پیانو کی آواز سن کر پیدا ہو جائے گی۔ محلے کے اوباش نوجوان تمھارے پیچھے پیچھے تمھیں کولج چھوڑنے جایا کریں گے اور واپس گھر لانے، اس امید میں کہ ایک نہ ایک دن تم ان میں سے کسی سے بات کرنے لگو گی۔

''ابھی مجھے سب ایک مشرقی مسلمان بیوہ سمجھتے ہیں، کل کو میں ان کے لیے پیغام دینے کو eligible☆ بن جاؤں گی۔ میرا مطلب ہے بیوی بنانے کو نہیں ہمارے گھر آ کر خوش گپیاں کرنے کو۔

☆۔ اہل، لائق

I know, I am past that age. (میں عمر کی اس منزل سے گزر چکی ہوں)۔"

جیور جیانا نے کہا،"او نو مما، ڈیئر یو آر اسٹل اے بیوٹی☆ میں حیران نہیں ہوں کیوں پپا نے آپ کو پیغام دیا تھا۔ آپ اس کی مستحق تھیں۔ آپ کے جسم کا ہر انچ ہر سینٹی میٹر مجھے پیارا ہے۔ معلوم ہے آپ مجھے کیا لگتی ہیں؟"

"کیا؟"

"Pieta" (پی ایتا: کنواری مریم مرحوم حضرت عیسیٰ کے جسم کو آغوش میں لیے ہوئے)

بے اختیاری میں سالوں بعد کلیرس کا سیدھا ہاتھ سینے تک آیا۔ ایک بار اوپر سے نیچے تک گیا اور جب وہ اس خیالی لائن کو کروس کرنے کے لیے الٹی چھاتی تک گیا تو اس نے ہاتھ کو جھٹک کر خود سے علاحدہ کر دیا۔

"For God's sake Georgi, do not give me blasphemous ideas. I am not that sinful."

(بے حرمتی کے خیالات جیورجی خدا کے لیے میرے دماغ میں مت بھرو۔ میں اتنی گنہگار نہیں ہوں۔)

جیور جیانا شرمندہ ہو گئی۔ ماں سے چپٹ کر بولی،"مما ڈیئر میں مسلمان ہوں یا کرسچین یہ تک مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔ لیکن یہ جانتی ہوں اگر آپ دنیا میں کسی سے ملتی جلتی ہیں تو وہ، وہ میری ہے جس نے زخمی جیسس کو اپنے زانوؤں پر لٹا رکھا ہے۔ کاش میری کے کوئی بیٹی ہوئی ہوتی تو میں سمجھتی، میں وہ ہوں۔"

ایک بار پھر کلیرس کا ہاتھ سینے پر صلیب بنانے کو ہوا اور جیور جیانا نے اسے تھام کر کہا، "Don't☆☆ ہم مسلمان ہیں۔"

۳

اس خاموش سے شہر کے اس معمولی سے گھر میں دس سال پہلے جیور جیانا نے اپنی ماں کے ساتھ آکر رہنا شروع کیا تھا۔ جہاں وہ پہلے تھی وہ جگہ اس بڑے شہر کے پرسکون علاقے میں

☆۔آپ ابھی بھی خوب صورت ہیں پیاری امی۔ ☆☆مت کیجیے۔

تھی جہاں جیور جیانا نے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہاں زیادہ تر لوگوں نے بنگلے بنوا رکھے تھے۔ کچھ ملٹی اسٹوریڈ بلڈنگز میں بھی رہتے تھے۔ علاقے میں نہ مسجدیں تھیں نہ کلیسا۔ ایک ایسی ہی بلڈنگ میں نیچے ڈپارٹمنٹل اسٹور تھا۔ اس سے اوپر کی منزل پر جو بورڈ لگا تھا اس پر انگریزی میں لکھا تھا ڈانسنگ اینڈ میوزک اکیڈمی اور ایک بیلیرینا کا سلہوٹ ایک طرف بنا تھا اور دوسرے سرے پر کتھک کے پاؤں۔

اس کے نیچے سے گزرتے ہوئے جیور جیانا نے اکثر پیانو کی آواز سنی تھی اور سڑک کی دوسری طرف جا کر اس نے اوپر کی منزل کے شیشوں میں سے کسی ناچتی ہوئی لڑکی کو دیکھنے کی بارہا کوشش کی تھی۔ اسے اکثر گمان ہوا تھا میں وہاں سے دیکھوں تو مجھے کوئی لڑکی بیلے ڈانس کرتی ہوئی نظر آئے گی یا بہت سی لڑکیاں ہوں گی جو پیانو کی آواز کے ساتھ بار☆ کو پکڑے ہوئے ڈانس کی مشق کرتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ سب اپنا دوسری طرف کا پاؤں ایک ساتھ ہوا میں اٹھا دیں گی اور لگے گا اب اڑنے والی ہیں۔ اس علاقے کی صفائی ستھرائی بے مثال تھی۔

اپنے فلیٹ میں صرف وہ رہتی تھی اور کلیرس۔ صبح اسکول کی بس آ کر اسے لے جاتی تھی، دوپہر کو چھوڑ جاتی تھی۔ گھر میں کوئی ہمہ وقت مرد نہیں تھا۔ ہفتہ دس دن میں ایک خوب رُو مرد آتا تھا جو کلیرس سے دس بارہ سال بڑا تھا۔ مما اسے حمزہ کہہ کر بات کرتی تھیں اور جہاں تک اسے یاد تھا وہ اسے پپا کہتی تھی۔ اس کی مونچھیں قالین کو صاف کرنے والے برش کی طرح گھنی تھیں اور سیاہ۔ وہ کئی بار جیور جیانا کے لیے مختلف کام کرتی ہوئی گڑیاں لے کر آیا تھا۔ کوئی ایپرن باندھے کھانا پکا رہی ہے، کوئی بنی ٹھنی پرس تھامے باہر جانے کو تیار ہے، کوئی بچے کے منہ میں فیڈر دے رہی ہے۔ گڑیوں کے علاوہ جیور جی کی پسند کی کھانے کی چیزیں بھی ہوتی تھیں۔ کورنڈ بیف☆☆ سوسے چیز، لولی پوپس اور مختلف ذائقوں اور رنگ والے دہی کے ٹبس (tubs)۔ پھر وہ کھیل میں لگ جاتی تھی۔ پورے وقت مما اور پپا ایک دوسرے کے آگے پیچھے پھرتے نظر آتے تھے۔ کھانے کے بعد چھوٹے بیڈ روم میں مما اسے سلانے آتی تھیں، کچھ گا کر سناتی تھیں اور خدا حافظ کر کے دروازہ بند کر کے چلی جاتی تھیں۔ اس کمرے ہی میں ایک کونے میں مما کی جانماز

☆۔Bar چمکیلا کھوکھلا پائپ

☆☆۔Corned Beef

بچھی تھی، ایک چٹائی پر۔ جب جھاڑو دینے والا لڑکا آتا تھا مما اس سے کہتی تھیں "Somia, keep my prayer rug on the bed."☆ اس پر صومیہ نے مما کو نماز پڑھتے بارہا دیکھا تھا پر پپا کو نہیں جن کے لیے ہمیشہ کلیرس نے کہا، ''انھوں نے میرے مسلمان ہونے میں میری مدد کی تھی ورنہ میں نہیں جانتی تھی خدا ایک ہے، دو یا تین یا خداؤں کی ایک پوری فوج ہے۔''

کبھی کبھی اس فلیٹ کے آخری دنوں میں جب جیور جیانا کی آنکھ کھلی تو اسے مما اور پپا کے جھگڑا کرنے کی آواز سنائی دی۔ جس کے بعد مما سسکیاں لینے لگتی تھیں۔ ایک موقع پر آدھی رات گئے اس نے سنا ''خدا کے لیے، میں تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' کمرے میں دھینگا مشتی کی سی آوازیں آرہی تھیں جیسے وہاں کئی آدمی ہوں، ایک سے زیادہ عورتیں اور ایک مرد۔ اس وقت جیور جیانا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح وہ جا کر مما کو اس مرد کے ظلم سے بچائے جسے وہ بھول سے پپا کہتی تھی۔

وہ پپا کے اس فلیٹ میں آنے کا آخری موقع تھا۔

اس سے پہلے ہی سے کلیرس نے کافی دنوں سے کہنا شروع کر دیا تھا، ''اب حمزہ ریگولر نہیں آتا ہے۔ پہلے (جب کی یاد جیور جیانا کو نہیں تھی) روز آتا تھا۔ پھر دو چار دن بعد ہوا، پھر ہفتہ اور اب چودہ چودہ دن گزر جاتے ہیں، لوگوں کے پیسے چڑھ جاتے ہیں اور وہ مجھے اتنے کم پیسے دے کر جاتا ہے کہ اس میں اسکول بس کا کرایہ اور گوشت سبزی تک پورا نہیں ہوسکتا۔''

ایک دن جب وہ زیادہ ہی پریشان تھیں جیور جیانا نے ازرہ ہمدردی کہا تھا، ''مما! آپ کہیں تو میں اسکول چھوڑ دوں۔''

''پھر کیا بنو گی؟''

''ہاؤس وائف۔''

''خدا نہ کرے۔'' کلیرس نے گھبرا کر کہا۔

''پھر کیا؟''

''اسکول ٹیچر، لیکچرر، ڈوکٹر، ایئر ہوسٹس۔''

☆۔ میری جانماز بستر پر رکھ دو۔

جیور جیانا نے فکرمندی سے کہا، ''مگر مما، اسکول ٹیچر بن کر تو بچوں کو مارنا پڑتا ہے۔
نرس؟''

کلیرس نے ہنس کر کہا، ''نہیں نرس نہیں، نہ ہاؤس وائف بلکہ ایئر ہوسٹس بھی نہیں۔''

''کیوں نہیں مما؟''

''اس لیے کہ عورت کے لیے سب سے برا پیشہ ہاؤس وائف ہونے کا ہے بلکہ وائف ہونے کا۔''

''آپ ہاؤس وائف نہیں ہیں؟''

کلیرس خاموش رہی۔ وہ اپنے نچلے ہونٹ کو اوپر کے دانتوں سے چبا رہی تھی۔

''تو پھر یہاں ایک وقت کا اسکول ہے جس میں ماسی کے بچے پڑھنے جاتے ہیں۔ میں بھی وہیں جانے لگوں۔ وہاں کے لیے اسکول بس بھی نہیں چاہیے۔ سب بچے، میں کھڑکی سے دیکھتی ہوں، اورنج☆ کلر کی یونی فورم پہنے پیدل آتے جاتے ہیں۔''

اس منحوس فلیٹ میں دو دفعہ کئی عورتیں اور مرد کلیرس سے ملنے آئے۔ انھیں پتا چل گیا تھا کلیرس کے برے دن آگئے ہیں۔ پہلی دفعہ جب وہ آئے اپنے ساتھ کیلے، آڑو اور خوبانیوں کی ٹوکری لے کر آئے۔ کافی دیر وہ لوگ اور کلیرس آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ کلیرس کا سر جھکا ہوا تھا اور جہاں فرش پر آنسو گر رہے تھے پانی کا دھبا بن گیا تھا۔ ان کی ناک سے بھی آنسو ٹپک رہے تھے۔

جیور جیانا ماں کے پاس گئی اور دیر تک پیچھے ان کے کندھے پر ٹھوڑی ٹیکے کھڑی رہی جیسے ضرورت پڑنے پر وہ ماں کی سہایتا کو فوراً موجود ہو۔ ایک عورت نے اسے بلانا چاہا اور رشوت میں ایک کیلا توڑ کر اس کی طرف بڑھایا لیکن اس نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔

اس عورت نے کیلے کو ایک مرد کی طرف بڑھایا، ''ریورینڈ آپ دیجیے، مان جائے گی۔''

لیکن وہ نہیں مانی۔

گھنٹے بھر وہاں بیٹھ کر وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ریورینڈ نے کلیرس سے کہا، ''میری

☆۔ Orange

بچی ہم تمھارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔تم نے سب کو چھوڑ دیا۔''

دوسرے مرد نے کہا،''ہم میں لوٹ آؤ۔ ورنہ نہ بڑھاپے میں کوئی پوچھنے والا ہوگا نہ دکھ بیاری میں اور نہ آخری رسومات کے لیے۔''

"The obsequies." ☆ ریورینڈ نے کہا۔

کلیرس ابھی تک اپنی جگہ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس آخری بات پر اس نے سر اوپر اٹھا کر ریورینڈ اور اس دکھ بیاری کی بات کہنے والے مرد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی بات پر زور دے کر کہا،''میں مسلم ہوں۔ شادی کے لیے مسلمان نہیں ہوئی تھی اور مسلم ہی مرنا چاہتی ہوں اور مسلم قبرستان میں دفن ہونا بھی... گڈبائی۔''

چاروں پانچوں ہڑبڑا کر زینے کی طرف چل دیے۔

جیورجیانا ان کے پیچھے پیچھے گئی۔ وہ بڑی تیزی سے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ جیورجیانا دروازہ بند کر کے ہنستی ہوئی اپنی مما کے پاس آئی اور بانہوں میں ان کا سر لے کر بولی،''مما میں انھیں باہر بند کر آئی۔''

ایک دن کلیرس کے رشتے دار آئے۔ انھیں بھی جیورجیانا نے یہاں آتے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ کلیرس ان میں سے کسی کو انکل، کسی کو آنٹ کہہ کر بات کر رہی تھی۔ اشارہ پا کر جیورجیانا بھی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ حمزہ کہاں تھا؟ اس کے دوسرے گھر والے کہاں تھے؟ کبھی وہ ملنے آئے ہیں؟

کلیرس نے نہ میں سر ہلایا۔ جیورجیانا نے زور دے کر کہا "No one comes here" ☆☆

مہمان ہنس پڑے۔ کلیرس کے چہرے پر پل بھر کو شادمانی کھیل گئی۔

''کتنی عقل مند لڑکی ہے۔'' ایک مرد نے جیورجیانا کے بالوں میں انگلیاں داخل کر کے اس کے سر کو کھجانا چاہا۔

جیورجیانا پیچھے ہٹ گئی۔

وہ لوگ کافی دیر بیٹھے لیکن کلیرس نہ ان کے لیے کوئی ڈرنک منگوا سکی نہ چائے بنا سکی کیوں کہ چینی کو ختم ہوئے کئی دن ہو چکے تھے اور دودھ والا کہہ گیا تھا،'' جب پچھلا حساب برابر ہو جائے گا تب میں دودھ لانا شروع کروں گا۔ اس سے پہلے نہیں۔''

ان لوگوں نے بھی ویسی ہی باتیں کیں۔ کیوں تم ان لوگوں میں آن پھنسیں، اپنا دین بھی گنوایا، نام بھی۔ حمزہ کا کچھ پتا ہے؟

ایک نے کہا،'' اس نام کا ایک گورنمنٹ افسر چند ماہ پہلے اپنے گھر میں مردہ پایا گیا تھا۔ کچھ برے چکروں میں تھا۔''

کلیرس چونک اٹھی۔ خبر سنانے والی نے کہا،'' خیر اس نام اور عہدے کا کوئی اور شخص بھی ہوسکتا تھا۔''

کلیرس نے کہا،'' مجھے چرچ سے مدد دلوا دیجیے کہ میں بیوٹیشین کا پارلر کھول لوں یا بچوں کا اسکول۔ تھوڑے ہی عرصے میں یہ قرض میں واپس لوٹا دوں گی۔ مجھے دونوں کام آتے ہیں۔ میرے لیے آپ بس اتنا ہی کر دیجیے۔''

'' چرچ انھیں مدد نہیں دے سکتا ہے جو کرسچین نہ ہوں یا مذہب چھوڑ کر کچھ اور بن چکے ہوں۔''

'' لیکن کتنے ہی مسلمان ملکوں کو مدد دیتا ہے۔''

اعتراض کرنے والے نے کہا،'' وہ دوسری بات ہے، سیاسی۔''

'' جہاں سیاسی مقصد نہ ہو وہاں مذہب کام کرنا چھوڑ دیتا ہے؟'' کلیرس نے معصومیت سے کہا۔

جاتے جاتے ان لوگوں نے کہا،'' سوچو تم اکیلی نہیں ہو۔ تمھارے ساتھ ایک بچی بھی ہے۔ اپنے مذہب میں لوٹ کر خداوند کی پناہ میں آجاؤ گی۔''

۴

تھوڑے دن بعد جیور جیانا نے خود کو جس گھر میں پایا وہ پہلے سے بہت چھوٹا تھا۔ وہ

علاقہ بھی اتنا صاف ستھرا نہیں تھا۔ مین ہولز کی سیاہ کیچڑ مہتر ڈنڈوں سے نکال کر وہیں بیچ سڑک پر ڈھیر کر جاتے تھے اور وہ راہ گیروں، گاڑیوں اور کھیلتے ہوئے بچوں کے دم سے خود بہ خود دن بھر ہی میں غائب ہو جاتی تھی۔ جہاں فلیٹ تھے ان کے گراؤنڈ فلور پر ریسٹورینٹ تھے، مٹھائی کی دکانیں اور جنرل اسٹور۔ ریسٹورینٹ فلمی گانے اونچی آواز میں بجاتے تھے۔

یہاں آکر کلیرس کی فکرمندی کم ہوگئی تھی لیکن ایک بار وہ اپنی جیورجی کو سینے سے لگا کر دیر تک روتی رہی، ''میں تمھیں پڑھا نہیں سکی جو میری بڑی آرزو تھی۔ تمھیں ڈوکٹر بناتی یا آرٹسٹ۔''

تھوڑی دیر میں جیورجیانا کو ماں کے بازوؤں میں گھبراہٹ ہونے لگی۔ یک بارگی وہ کسمسا کر بازوؤں سے نکلی اور کلیرس کے سامنے کھڑی ہو کر بولی، ''مما! میں پھر اسکول جانے لگوں؟ بس کی بھی ضرورت نہیں ہے، یہاں سے پچھلے گھر کا اور وہاں سے اسکول کا رستہ مجھے یاد ہے۔'' اس نے کلیرس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

ایک دن جب وہ بچی کو گود میں لٹائے اسی طرح کی باتیں کر رہی تھیں کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ جیورجیانا سمجھ گئی کون آیا تھا اور اس کا آنا اسے پسند نہیں تھا۔

اسے آرام کرسی پر بٹھا کر کلیرس خود دروازہ کھولنے گئی اور جب لوٹی تو جیسا جیورجیانا سمجھ رہی تھی، ہشاس بشاس تھی۔ اس کے ساتھ فتحیاب تھا۔ ڈوکٹر فتحیاب جس کے بال ہمیشہ سنورے رہتے تھے اور کوٹ اور پتلون اسی صبح کے استری کیے ہوئے لگتے تھے۔ اکثر اسٹیتھسکوپ اس کی گردن سے لٹکی ہوتی تھی یا کوٹ کی جیب سے جھانکتی نظر آتی تھی۔ اس شخص کو دیکھ کر ایک حس جیورجیانا کو بتا دیتی تھی کہ اب اسے کمرے سے باہر جا کر کھیلنا چاہیے یعنی ماں بیٹی کا کھیل ختم۔

جیورجیانا فتحیاب سے اس حد تک نفرت کرنے لگی تھی کہ ایک دن جب اس نے ماں سے کہا، "Mama I have tummy ache." (میرے پیٹ میں درد ہے) اور اچانک ڈوکٹر فتحیاب آگیا اور کلیرس نے کہا، ''فتح کو دکھا دو'' تو وہ پیٹ پر سے ماں کا ہاتھ ہٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی

اور "Thank you mama, it is over now."☆ کہتی ہوئی باہر صحن میں بھاگ گئی۔

کلیرس نے جیور جیانا سے کئی بار کہا،'' وہ تمھارا پپا ہے، نیا پپا'' لیکن ہر بار جیور جیانا نے کہا،''نہیں ہر بچے کا بس ایک پپا ہوتا ہے۔ نہ پرانا نہ نیا نہ...'' انگلیوں پر گنتے ہوئے اس نے، ''نہ دو، نہ تین، نہ چار۔'' کہا۔

پہلی بار یہ بات سن کر کلیرس کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ جیور جیانا کے رویے کی عادی ہوگئی۔

فتحیاب کو جیور جیانا انکل کہنے لگی لیکن پیار سے نہیں، بس مما کو خوش کرنے کے لیے۔

اب گھر کی حالت سدھر گئی تھی۔ بیٹھنے کے کمرے میں قالین بچھ گیا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی بے میل چائے کی پیالیوں اور چائے دانی کی جگہ نئے ٹی سیٹ نے لے لی تھی جس کی ہر چیز کی گگر پر سنہری پٹی تھی۔ لیکن جیور جیانا انھی پرانی پیالیوں میں ادبدا کے چائے پیتی تھی۔ کمروں کے دروازوں پر پردے لٹک گئے تھے اور صبح ناشتے میں اسے چیز کیوبس☆☆ اور فرائڈ انڈا ملنے لگا۔ ہفتے دو ہفتے بعد کلیرس جب ڈوکٹر فتحیاب کے ساتھ شوپنگ کرنے جاتی تھی تو جیور جیانا کے لیے کبھی چکن سوسے جیز☆☆☆ کبھی کورنڈ بیف لیتی آتی تھی۔ لیکن ساری چیزیں میز پر دھری کی دھری رہ جاتی تھیں۔

پردے بھی انھی شوپنگز پر جانے کا ثمرہ تھے اور قالین بھی۔ شروع کے دنوں میں مڈبھیڑ ہونے پر بلڈنگ میں رہنے والوں نے دونوں کو کچھ دلچسپی سے دیکھا پھر اس کے عادی ہو گئے کیوں کہ اور کوئی مرد آمنہ کے گھر نہیں آتا تھا نہ اس کے ساتھ کہیں جاتا تھا۔

ڈوکٹر فتحیاب معمولی سی بات پر اتنا اونچا قہقہہ لگاتا تھا کہ لگتا تھا اس کی آواز چھت اور دیواروں سے ٹکرا گئی ہے اور وہ گر پڑیں گی۔ لیکن اس کی ہنسی اکیلے کی ہنسی ہوتی تھی نہ اس میں کلیرس شریک ہوتی تھی نہ جیور جیانا۔

اکثر یوں ہوا کہ وہ رات وہیں سویا اور صبح جب بن ٹھن کے بال سنوارنے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو ہر رخ سے اپنے چہرے کو دیکھ کر کلیرس سے کہتا تھا،'' دیکھو تمھارے

☆۔اب ختم ہوگیا۔ ☆☆۔پنیر کے تکون ٹکڑے۔ ☆☆☆۔مرغی کے لمبے کباب۔

سامنے جیمس فلاں کھڑا ہے، ہولی وڈ نمبر ون ہیرو۔" پھر وہ کلیرس کے گال کو ایک انگلی سے چھو کر کہتا تھا، "تم بڑی خوب صورت ہو مگر اپنا بھی جواب نہیں ہے۔"

ایسے موقعے پر جیور جیانا دوسری طرف دیکھنے لگتی تھی۔

اپنی دانست میں فتحیاب کی مماثلت ہولی وڈ کے ہیروز سے بدلتی رہتی تھی۔ ایک صبح وہ اگر گریگوری پیک ہوتا تھا تو دوسری صبح ٹیٹانک کا ہیرو۔

فتحیاب کی ان باتوں کو ناپختہ شخصیت سمجھ کر کلیرس بس ہنس دیتی تھی کیوں کہ بیس پچیس سال کی لڑکی اپنی فہم اور باتوں میں عورت ہوتی ہے بیس پچیس سال کا نوجوان، لڑکا۔ لیکن اس دن وہ شدت سے چونک پڑی جب اس نے بستر میں کہا، "تصور کرو میں نہیں تمھارے ساتھ ہنری فلاں ہے۔"

کلیرس پانی پانی ہو رہی تھی کہ فتحیاب نے کہا، "اس وقت یہاں تم نہیں، میں محسوس کر رہا ہوں اوڈیٹ (Odette) فلاں ہے۔"

ایک دم کلیرس کے جسم اور دماغ جیسے پیتل پگھلانے کی بھٹی بن گئے۔ بڑی مشکل سے اس پہاڑ جیسے بدن کو خود پر سے ڈھکیل کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر پانی پینے چلی گئی۔

ایک دن جیور جیانا کے پوچھنے پر کہ ڈوکٹر انکل یہاں کیوں آتے ہیں؟ کلیرس نے کہا، "میری پینشن کے کام سے۔ تمھیں معلوم ہے وہ مجھے بیوہ کی پینشن دلوانے میں میری مدد کر رہے ہیں۔"

"کام تو دن میں ہوتا ہے رات کو یہاں کیوں رہتے ہیں؟" ڈرتے ڈرتے جیور جیانا نے کہا، پینشن اور ماں کے بیوہ ہونے میں اسے زیادہ دلچسپی نہیں تھی، تھی تو اس بات میں کہ جس رات فتح یہاں نہیں ہوتا تھا وہ ماں کے ساتھ سوتی تھی۔

"تم سے شادی تو نہیں کریں گے نا؟"

ایک لمحے خاموش رہ کر کلیرس نے کہا، "He is a nice man."☆

ڈاکٹر فتح کا کلینک کہاں تھا، ان کے گھر کے اور لوگ کہاں تھے، وہ کس وقت کام پر

جاتے تھے؟ ان سوالوں کے جواب کلیرس کے پاس نہیں تھے۔ کلینک کیا ہوتا ہے جیور جیانا جانتی تھی۔ بیوہ کیا؟ پینشن کیا؟ انھیں سمجھانا کلیرس کے لیے آسان تھا۔ بعد کے دنوں میں اکثر ایسا ہوا کہ بیوہ کا لفظ سن کر جیور جیانا خوشی سے کہہ بیٹھتی تھی، ''جیسے مما آپ۔''

''پینشن ملنے لگے تو ہمارے اچھے دن آ جائیں گے۔ میں گھر میں اسکول کھول لوں گی۔''

یہ اس دن کی بات ہے جس دن جیور جیانا نے ماں کے پاس فتح کے آنے کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔

ماں کے اسکول کھولنے کی بات سن کر بیچ میں بولی، ''میں بھی اس میں پڑھنے لگوں گی۔''

''یا بیوتیک اور ہمیں پیسے کی فکر نہیں ستائے گی۔''

بچوں کی حس چڑیوں کی حس ہوتی ہے۔ چڑیاں بن سکھائے جانتی ہیں کون سا بجلی کا تار انھیں اس پر بیٹھنے سے ختم کر دے گا، انسان نہیں جانتے۔ کسی حد تک انسان کے بچوں میں یہ حس ہوتی ہے۔ وہ ایک برے مرد اور عورت کو بن بتائے پہچان جاتے ہیں، بڑے نہیں، وہ باآسانی ان کے شکار ہو جاتے ہیں۔ فتح کو دیکھتے ہی جیور جیانا کا چہرہ اتر جاتا تھا۔

ایک شام کلیرس فتح کے ساتھ جا کر آدھی رات کو گھر لوٹی۔

جیور جیانا کھڑکی سے سڑک کو دیکھ رہی تھی۔

کلیرس کی آنکھوں کے نیچے اور گالوں پر نیلے نشان تھے، بلاؤز کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور ڈریس جو چند ہی ماہ پہلے خریدا گیا تھا جگہ جگہ سے پھٹے ہونے کی وجہ سے لگتا تھا اب فرنیچر کو جھاڑنے ہی کے کام آئے گا۔ تین چار جگہ خون کے دھبے بھی تھے، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اہم بات یہ تھی کلیرس شام گزارنے کے لیے گئی ڈوکٹر فتح کے ساتھ تھی اور اتنی رات گئے لوٹی تنہا تھی۔

اس نے جو چادر اوڑھ کر وہ گھر لوٹی تھی، کرسی پر ڈال دی اور خود صوفے پر گر پڑی۔

ان دنوں کی باتیں جیور جیانا کے لیے خواب کی سی تھیں۔

کلیرس کا زیادہ وقت خط لکھنے اور درخواستیں ٹائپ کرنے میں گزر جاتا تھا۔ خوش قسمتی سے اچھے دنوں میں کلیرس نے ایک بے بی ٹائپ رائٹر خرید لیا تھا، اب وہ کام آ رہا تھا۔ ورنہ ہاتھ سے لکھے ہوئے خطوں پر سرکاری دفتروں میں کون دھیان دیتا ہے۔

کلیرس خود ہی ان خطوں کو پوسٹ کرنے جاتی تھی اور واپسی میں کھانا پکانے کی چیزیں

لے کر لوٹتی تھی۔ فروعات کے لیے اس کے بجٹ میں گنجائش نہیں تھی، نہ ان کی فرمائش کبھی جیور جیانا نے کی۔

پھر بادل کچھ چھٹ گئے، لیکن بالکل نہیں، اور جاڑوں کی خوش کرنے والی دھوپ نکل آئی۔ جیور جیانا ماں کے پاس کھڑی انتظار کرتی تھی ٹائپ رائٹر کے لائن ختم ہونے کی گھنٹی کب بجنے کو ہوگی اور کلیرس آخری ایلفبیٹ☆ پر اسے انگلی مار لینے دے گی۔ ہر بار گھنٹی بجنے پر وہ چہک کر کہتی تھی، "ٹائپ رائی ٹر کو میں نے بجایا۔"

کلیرس کی دوڑ دھوپ میں بس گروسری لانا اور خط پوسٹ کرنا نہیں تھا کبھی کبھی اسے گورنمنٹ آفس بھی جانا پڑتا تھا جہاں کبھی حمزہ ملازم تھا اور جہاں اب اس کے رشتے دار بھی، جنھیں کلیرس نے کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا، نظر آتے تھے۔

ایک بار ایک عورت ان لوگوں کے ساتھ نظر آئی، بالکل گنوار سی۔ اس نے خود کو حمزہ کی بیوی بتایا۔ کلیرس چونک پڑی۔ وہ عمر میں کچھ نہیں تو حمزہ سے پندرہ بیس سال بڑی ہوگی۔ لیکن وہ نکاح نامہ نہیں پیش کر سکی، نہ ہی اس کے ساتھ آنے والے مرد بہت سی باتوں کا صحیح جواب دے سکے۔ انھیں آفس سپرنٹنڈنٹ نے مع ایک بہن کی گالی کے باہر نکلوا دیا۔

وہاں آفس میں کچھ لوگوں کو کلیرس سے ہم دردی سی ہوگئی تھی کہ یہ عورت جو عیسائی سے مسلمان ہوئی اب مسلمانوں میں بے سہارا تھی اور اس کے عیسائی رشتے دار اس کے لیے اس وقت تک کچھ بھی کرنے کے لیے تیار نہیں تھے جب تک وہ یسوع کے گلّے میں دوبارہ نہیں آجاتی۔ دفتر والوں نے آپس میں یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ اگر وہ واپس چرچ میں چلی گئی تو حمزہ کی بیٹی بھی خود بخود عیسائی بن جائے گی۔

ایک آدمی نے کہا، یہ اپنے حمزہ بھائی کی بیوہ ہے، اس کا کام کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس بات نے ان اڑیل لوگوں پر چابک کا کام کیا اور کیس تیزی سے چل پڑا۔

اُن دنوں نہ جانے کہاں سے ایک رکشے والا کلیرس کی زندگی میں زبردستی گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلے تو کلیرس نے نوٹس نہیں لیا کہ یہ وہی رکشے والا ہے جو کل مجھے یہاں لایا تھا۔ پھر

☆ alphabet

وہ اسے باقاعدگی سے کھڑا ملنے لگا۔ اپنی بلڈنگ کے نیچے، عدالت کے باہر، گورنمنٹ آفیسز کے باہر کے پیپل کے پیڑ کے نیچے۔ یہاں تک کہ ایک دن کلیرس نے کہا، ''مجھے تو لگتا ہے جیسے تم صرف میرے لیے رکشا چلاتے ہو یا میں رکشے کی مالک ہوں۔''

رکشے والے نے کہا، ''وہ تو آپ ہیں۔''

''کیسے؟'' کلیرس نے بے خیالی میں کہا۔

''آپ اسے اپنا ہی رکشا سمجھئے۔ مجھے معلوم ہے آپ بے بی کو اس وجہ سے اسکول نہیں بھیجتی ہیں کہ وہاں کی بس نہیں آتی اور...''

''اور؟''

''...اس دھوپ میں آپ کو رکشا کے انتظار میں گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا ہے۔''

کیا اس کی زندگی کی کتاب کا ایک نیا باب کھلنے والا تھا؟ کلیرس نے تردد سے سوچا اور وہاں سے چل پڑی۔

رکشے والا اس کے پیچھے پیچھے آیا، ''میڈم رکشا کھڑا ہے، آپ کا ہے۔ چلیے میں گھر چھوڑ آتا ہوں۔''

کلیرس نے کہا، ''اس وقت میرا پرس خالی ہے۔''

رکشے والے نے دل میں کہا، اسے بھرنا میرا کام ہے اور بولا، ''میں نے آپ سے کرائے کے لیے کب کہا، دو چار دن بعد اکٹھے دے دیجیے گا۔ بے بی گھر پر اکیلی ہے، جلدی کیجیے گھر پہنچنے کی۔''

کلیرس نے سوچا شاید یہ بھی کوئی اللہ کا بندہ ہے۔ میں حالات کے ناساز ہونے کی وجہ سے پیرانوئیڈ☆ ہوتی جارہی ہوں۔ یہ شخص نہ تو چرس پینے والا لگتا ہے نہ گرہ کٹ۔''

اگلے دن یا شاید اس کے بعد کے دن جب کلیرس کو اندازہ ہو چلا تھا، یہ شخص ایسا ہے کہ اگر اس کے رکشے میں بیٹھ کر میں سو بھی جاؤں تو بھی منزل پر ہی اتارے گا، کہیں اور نہیں لے جائے گا، آدھا رستہ طے کرکے رجب نے کہا، ''آپ کی بلڈنگ کے سامنے والی بلڈنگ میں

☆۔ paranoid (شکی)

سب سے اوپر کی منزل میں ایک صاحب رہتے ہیں، وہ آپ کی بہت عزت کرتے ہیں۔''

کلیرس کی غنودگی ٹوٹ گئی اور وہ چوکنا ہو کر بیٹھ گئی، ''کیوں؟''

''کہتے ہیں، جن صاحبہ کو تم لاتے لے جاتے ہو، شکل سے بہت پڑھی لکھی لگتی ہیں۔ سلیقے کے کپڑے پہنتی ہیں۔ لیکن مجال ہے سڑک پر کوئی ان کو نظر بھر کر دیکھ لے۔ میں نے تفریح لینے کو کہا، کیا بدصورت ہیں، کالی ہیں، بوڑھی ہیں جو انھیں آنکھ اٹھا کر کوئی نہیں دیکھے گا؟

''انھوں نے کہا کہ رجب تمھاری عقل بھینس کی عقل ہے، یہ سب میں نے کب کہا۔ میں نے کہا، پھر آپ کا کیا مطلب ہے؟ کوئی عورت دیکھنے میں یوروپین لگے، جوان ہو، پھر اسے کوئی کیوں نہیں دیکھے گا۔ بولے اس کے چلن کی وجہ سے... نظر نیچی، سر اور گردن ڈھکی ہوئی، دیکھنے والا ادب ہی کر سکتا ہے ایسی عورت کا۔ تم انھیں مجھ سے ملوا سکتے ہو؟''

کلیرس نے رکشے کی لوہے کی دونوں طرف کی روڈز کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے رکشے سے اتر کر پرس کھولا ایک نوٹ نکال کر رجب کو دیا اور بولی، ''تمھارے تین وقت کے پیسے ہیں، مجھے اب رکشا نہیں چاہیے ہوگا۔''

''میری خطا؟''

''مجھے نہ تمھارا رکشا چاہیے نہ کسی اور کا۔ جہاں جانا ہوگا پیدل جاؤں گی۔''

پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر وہ اپنی بلڈنگ میں چلی گئی۔ کچھ دور تک رکشے والا اس کے پیچھے پیچھے آیا، جہاں سیڑھیاں شروع ہوتی تھیں، کچھ دیر کھڑا رہا، پھر واپس چلا گیا۔

اوپر جیور جیانا سڑک کے رخ کھلنے والی کھڑکی سے چپکی کھڑی تھی۔ کلیرس نے اسے وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور پوچھا، ''کون تھا؟''

''رکشے والا۔''

''کچھ دن کے لیے اس کھڑکی سے جھانکنا بند کر دو۔'' کلیرس نے کہا، ''اور اگر میری غیر موجودگی میں تمھیں مجھ سے ملانے لے جائے یا کہیں سے گھر لانے کو کہے تو اس سے بات نہیں کرنی ہے۔''

جیور جیانا نے ماں کی ہر بات کو بغیر چون و چرا کیے ماننا سیکھا تھا۔ نہ اِس وقت اس نے

پوچھا کیوں، نہ اُس رات اس نے کوئی سوال کیا تھا جب ماں پھٹے ہوئے کپڑوں میں گھر لوٹی تھی۔ اتنی بات وہ ان عیسائی مہمانوں کی گفتگو سے سمجھ گئی تھی کہ اسے حمزہ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس رات وہ چٹیلے پھل کی حالت میں گھر لوٹی تھی اور کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے۔ پھر کتنے ہی دن فتح کا ذکر نہیں آیا۔ جیور جیانا کے دماغ نے کہا، اس سے بھی مما کو نہیں ملنا چاہیے تھا۔

پھر یہ رکشے والا جو پہلے روز صبح سے آکر بلڈنگ کے نیچے کھڑا ہو جاتا تھا اور انھیں لے جاتا لاتا تھا، اب اس سے مما کترا رہی تھیں تو کیا وہ بھی حمزہ اور فتح کی طرح مما کو دکھ دینے والا مرد تھا؟

پھر ایک خیال دماغ میں آکر نکلا چلا گیا، آئندہ نہ وہ کسی سے باتیں کریں اور اسے گھر لائیں نہ میں بڑی ہو جانے پر کسی مرد سے بات کروں گی۔ I hate them all, I hate them.☆

اس کے بعد کے دن ایسے تھے جیسے ماں بیٹی دونوں کو زندان میں ڈال دیا گیا ہو۔ وہاں روشنی آتی تھی اور ہوا چلتی تھی ورنہ یہ جگہ کسی تاریک زیرِ زمین قید خانے (dungeon) سے کم نہیں تھی۔

دن میں ایک چکر شام کو اندھیرا ہونے پر کلیرس نیچے کا لگاتی لیکن اپنے ساتھ جیور جیانا کو نہیں لے جاتی تھی۔ اس روز کے ایک چکر سے گھر چل رہا تھا ورنہ گھر میں نہ آٹا ہوتا، نہ مٹی کا تیل۔ رفتہ رفتہ جیور جیانا کو موٹا ریکسن کا تھیلا جس میں مما سامان لاتی تھیں، اپنا مونس لگنے لگا۔ اس میں سے نہ اب چوکلیٹ نکلتے تھے نہ سوسے جیز لیکن جب ایک ایک کر کے کلیرس مٹی کے تیل کی بوتل، پولیتھین بیگ میں چاول اور دال نکالتی تھی تو جیور جیانا کو لگتا تھا اس کے جسم میں جان آگئی ہے۔ وہ روز چاولوں کو پلاسٹک کی ٹرے میں پھیلا کر ماں کی طرح ان میں سے کنکر اور سوکھے ڈنٹھل اور بے جوڑ چیزیں بیننے لگتی تھی۔

ٹیلی فون جلد ہی کٹ گیا، اسے فتح نے لگوایا تھا، اسی نے پچھلے چند ماہ میں اس کا بل ادا

☆۔ مجھے ان سب سے بہت نفرت ہے، ان سے نفرت ہے۔

کیا تھا۔

ایک دن اوپر کے فلیٹ سے کوئی لڑکا اسے بلانے آیا،'' آنٹی آپ کا ٹیلی فون ہے۔''
کلیرس کو سخت تعجب ہوا وہاں کس کا فون آسکتا تھا۔ اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے پوچھا۔

''تمھیں کیسے پتا چلا کہ میرا ٹیلی فون ہے؟''

لڑکے نے کہا،'' اس نے فلیٹ کا نمبر بتایا اور کہا اس میں بس ایک ماں بیٹی رہتی ہیں اور یہاں تو کسی فلیٹ میں آٹھ دس سے کم آدمی نہیں رہتے ہیں پھر پہچان لینا کون سی بڑی بات تھی۔''

''اور آواز...؟'' کلیرس پوچھتے پوچھتے رہ گئی کہ کس کی تھی۔

آواز مرد کی تھی،'' تم نے رکشے والے کو کیوں منع کر دیا؟'' کسی نے خفگی سے کہا۔

کلیرس چپ رہی... سانس بھی وہ ماؤتھ پیس سے منھ پرے لے جا کر لے رہی تھی۔

''کہو تو اسے دوبارہ بھیج دوں۔''

کلیرس ریسیور کو پکڑے رو رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر تخت پر بیٹھی عورت اسے تعجب اور دردمندی سے دیکھنے لگی۔ وہ شاید اس لڑکے کی ماں تھی جو اسے بلانے آیا تھا۔

''نہ سہی، سوچ لو، دونوں بھوکی مر جاؤ گی... یا یہ شہر چھوڑ کر خود بھاگ جاؤ گی یا تمھاری لاش سمندر میں پھنکوا دی جائے گی۔ جو عیش تم اپنی بیٹی کو نہیں کرا سکیں ہم کرائیں گے۔''

ریسیور رکھ کر جب وہ شکریہ ادا کرنے کے لیے اس عورت کی طرف پلٹی جس کا یہ فلیٹ تھا تو اس نے کہا،'' تمھارے شوہر کا فون تھا؟''

کلیرس سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور رونے لگی۔ ماں کے اشارے پر لڑکا بھاگ کر نیچے گیا اور سوفٹ ڈرنک کی بوتل لے آیا۔ بڑی مشکل سے کلیرس نے کہا،''نہیں دھمکیوں کا۔''

''تمھیں طلاق دے گیا ہے؟''

کلیرس نے ہاں میں سر ہلایا۔

عورت نے کہا،'' مجھے وہ آدمی ٹھیک نہیں لگتا تھا۔''

کلیرس چونک پڑی۔

گھر میں نہ دودھ آ رہا تھا، نہ چینی تھی، نہ چائے۔ جو نوٹ کلیرس نے رکشا والے کو دیا تھا وہ ان ضروریات کے لیے کئی دن کو کوفی ہوتا۔ اس کے بعد نہ نوٹ تھے نہ سکّے۔ فتح کے بعد جو گزر بسر ان چند مہینوں میں ہوئی وہ زیور، قالین، کروکری سیٹ بیچ کر، جن میں سے کچھ حمزہ کے دنوں کی یادگار تھے، کچھ فتح کے دور کے۔

دروازے کی گھنٹی پہلے بجتی تھی پھر وہ بھی خاموش ہوگئی۔

اس کی جگہ دروازے پر کھٹ کھٹ نے لے لی جن کے لیے نہ وہ اٹھ کر دروازے تک جاتی تھی، نہ جیور جیانا کو جا کر پوچھنے کی اجازت تھی کہ کون ہے؟

ایک دن نہ جانے کیسے ایک عورت دروازے پر آئی اور اس وقت تک کھٹ کھٹ کرتی رہی جب دوسرے فلیٹ والے بھی وہاں رک کر اسے آوازیں دینے لگے۔

''دروازہ کھولو مہمان ہیں، دروازہ کھولو۔''

ایک سن رسیدہ شخص نے کہا، ''ہوسکتا ہے دونوں مرچکی ہوں۔''

''یا ماں نے بیٹی کو مار کر خودکشی کرلی ہو، ان کے گھر میں فاقہ تھا۔ بے چاری پہلے ایک دن کے آٹے چاول کے لیے گھر سے نکلتی تھی، اب وہ بھی بند کر دیا ہے۔''

''میرا خیال ہے ایک ایک کر کے گھر کی ساری چیزیں بیچ چکی تھی، میں نے خود پرانا مال خریدنے والوں کو یہاں سے قالین لے جاتے دیکھا ہے۔''

ایک نے سب کو چپ رہنے کا اشارہ کر کے اپنی ناک دونوں پٹوں کے بیچ کے دروازے سے ملا کر سونگھتے ہوئے کہا، ''نہیں خون یا لاش کے سڑنے کی بو نہیں ہے۔''

لوگوں میں بحث ہونے لگی کہ دروازہ توڑ ڈالنا چاہیے، نہیں توڑنا نہیں چاہیے، پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔ اور جب یہ بات ہو رہی تھی، کلیرس نے دروازے کے پاس آ کر پوچھا۔

''کون ہے؟''

اس لڑکے نے جو پہلے کلیرس کو فون کے لیے بلانے آیا تھا کہا، ''آنٹی آپ کے مہمان آئے ہیں۔''

اور اس کے ساتھ ہی ایک عورت کی آواز آئی، "دروازہ کھولو میں تمھاری رشتے دار ہوں۔"

کلیرس نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا۔ اتنے آدمیوں کے نرغے میں وہ عورت ہوش و حواس کھو چکی تھی۔ ان سے خود کو چھڑا کر بغیر اجازت وہ اندر گھس آئی اور کلیرس سے بولی، "دروازہ بند کر دو۔"

کلیرس نے دروازہ بند کر کے اسے پانی دیا اور ہوا کے لیے ایک چائنیز پنکھا جو اچھے دنوں کی یادگار تھی، جھلنے لگی۔

سانس درست ہونے پر عورت نے کہا، "میرا نام کلثوم ہے۔ کبھی تم نے سنا تھا؟"

"نہیں،" کلیرس نے کہا۔ "مگر پہلے یہ بتایئے آپ کون ہیں اور یہاں کیوں آئی ہیں؟"

"میں فتح کی دوسری بیوی ہوں۔ پہلی بھی اسی شہر میں ہے۔ فتح نے تم سے باقاعدہ شادی کی تھی؟"

کلیرس نے جیور جیانا پر ایک نظر ڈالی اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"نہیں۔" کلیرس نے کہا، "وہ میرا پنشن کا کام کرا رہے تھے، میں بیوہ ہوں، میرے شوہر مر چکے ہیں..."

"اور؟"

"تھوڑی بہت پیسے سے بھی مدد کر رہے تھے۔ اللہ واسطے، جب پنشن ملنے لگتی تو میں انھیں لوٹا دیتی۔"

کلثوم نے ایک نظر پورے گھر پر دوڑائی، پھر کلیرس کی خالی انگلیوں، گردن اور کانوں پر۔

"واقعی اس گھر کو مدد کی ضرورت تھی۔" اس نے زیرِ لب تلخی سے کہا۔

"وہ کیا؟"

"کچھ نہیں۔ لگتا ہے اس نے کچھ بھی تمھاری مدد نہیں کی، الٹا تمھیں لوٹ کر چل دیا۔"

کلیرس کی آنکھوں سے باوجود روکنے کے آنسو ٹپکنے لگے۔

"اچھا ہوا تم سے شادی نہیں کی تھی ورنہ آج کو میری طرح ہوتیں۔ نہ مجھے طلاق دیتا ہے

نہ زہر کا انجکشن لگا تا ہے۔'' کلیرس چونک پڑی۔

''اور یہ راز کی بات بھی جان رکھو، وہ ڈاکٹر تو ہے لیکن جتنا بڑا خود کو ظاہر کرتا ہے اتنا بڑا نہیں۔ نہ وہ کبھی انگلینڈ گیا تھا، نہ امریکا۔ یہاں اسپیشلسٹ بنا بیٹھا ہے۔ کہتا ہے، عرب گیا تھا وہاں میڈیسن کا پروفیسر تھا۔ میرا مشورہ یہ ہے تم اس شہر کو چھوڑ کر کسی اور چھوٹے شہر میں جا کر رہنے لگو۔ ورنہ وہ تمھیں اور تمھاری بیٹی کو برابر تنگ کرتا رہے گا۔''

''کیسے تنگ کرتا رہے گا؟''

''دھمکیوں سے، جھوٹا کیس بنا کے۔''

''لیکن کیوں؟''

''اس لیے کہ تم نے اس سے اس کے منھ کا نوالہ چھین لیا ہے۔ وہ اتنے دن اس آس میں تھا کہ نرسنگ ہوم یا میٹرنٹی ہوم کھولے گا اور ہر کام تمھاری آڑ میں ہوگا۔ تم شکل سے یوروپین لگتی ہو اور اس چیز کی بڑی قیمت ہے۔ سب تمھیں ڈاکٹر یا میٹرن سمجھ کر وہاں آتے اور اس کی دُہری تہری آمدنی ہوتی۔''

کلیرس خاموش رہی۔

''افواہیں تو اب بھی پھیل رہی ہیں کہ تم اس کی داشتہ ہو۔''

کلیرس نے کہا، '' آپ کو نہیں معلوم اس نے میرے ساتھ کیا کیا؟''

''جانتی ہوں اور مجھے اندازہ ہے وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔''

کلیرس نے کہا، ''میں بس اتنے دن اور اس شہر میں رہوں گی کہ مجھے پنشن ملنے لگے۔ اس کے لیے تھوڑی بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے، کہیں اور چلی گئی تو اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں گی۔''

''پنشن ملنے کی امید ہے؟''

''ہے۔'' کلیرس نے کہا، ''اس کے لیے اب میں خود بھاگ دوڑ کر رہی ہوں۔''

''مجھ سے، بلکہ ہم دو سے تو تم خوش قسمت ہو کہ پنشن ملنے لگے گی۔ ہم دونوں کے نصیب میں تو بیوہ ہونا بھی نہیں بدا ہے۔''

کلیرس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ آ گئی جو آخری دیدار کرنے والوں کو کبھی کبھی مرنے والے کے چہرے پہ نظر آتی ہے جیسے پیچھے رہ جانے والی دنیا پر ہنس رہا ہو۔

''تم شادی کے لیے مسلمان ہوئی تھیں؟'' کلثوم نے بے رحمی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' کلیرس نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''اب اپنے پرانے مذہب میں واپس نہیں چلی جاؤ گی؟''

''نہیں۔'' کلیرس نے پہلے سے بھی سخت لہجے میں جواب دیا۔

''دوسری شادی بھی نہیں کرو گی؟''

''نہیں۔'' کلیرس نے دوپٹے کی اوٹ میں ایک انگلی کو دوسری پر چڑھا کر کہا اور تلخی سے بولی، ''آپ میرا انٹرویو لینے آئی ہیں؟ سنئے مسز فتح یاب یا آپ جو بھی ہیں، مجھ سے میرے شوہر حمزہ نے اس وجہ سے شادی کا پیغام دیا تھا کہ میں مسلمان ہوگئی تھی اور تنہا تھی۔ بعد میں مجھے حمزہ سے نفرت ہوگئی اور اب وہ اس دنیا میں ہے بھی نہیں لیکن اس سے نفرت اب بھی قائم ہے۔ وہ اس لائق ہی نہیں تھا کہ اس سے کوئی عورت شادی کرتی۔''

کلثوم نے دلچسپی سے پوچھا، ''اس میں کوئی کمی تھی؟''

لیکن اس کی بات سننے کو کلیرس رکی نہیں۔ بولی، ''اسلام کو میں کیوں چھوڑنے لگی، اس کا مطالعہ کر کے میں مسلمان ہوئی تھی اور اب بھی ہوں۔ اس کے لیے مجھے اپنے رشتے داروں کو چھوڑنا پڑا لیکن مسز فتح مجھے خود سے زیادہ آپ کے اسلام چھوڑنے کا خطرہ ہے کیوں کہ آپ نے اسے پڑھا ہی کہاں ہے، اس پر غور ہی کب کیا ہے؟ شوہر کے دھوکا دینے سے اُس سے وفاداری اور محبت متزلزل ہو سکتے ہیں، ایمان نہیں۔''

مسز کلثوم فتح یاب کے لہجے کی تلخی کو خفت اور گھبراہٹ نے کند کر دیا۔

۵

میلاد شریف کے لیے آنے والی عورتیں کھانے کے بعد بھی وہیں رکی رہیں۔ ان میں شادی بیاہ کی باتیں ہو رہی تھیں اور کون کون اس سال حج پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آمنہ اور

صومیہ کے پاس گفتگو میں شرکت کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سب عورتیں جانتی تھیں، آمنہ عیسائی سے مسلمان ہوئی تھی۔ اس کی ماں اس بات پر راضی نہیں ہوئی تھی، باپ پہلے ہی مر چکا تھا اور ماں کے مرنے کی اسے اطلاع نہیں دی گئی۔ جب ساری عیسائی برادری اس کے خلاف ہوگئی اور ایک بچی کے بعد شوہر جوانی ہی میں مر گیا تو وہ بیٹی کے ساتھ یہاں چلی آئی۔ دونوں کا گزارہ بیوہ کی پنشن پر تھا یا اس اضافی رقم پر جو آمنہ لڑکیوں کو انگریزی پڑھا کر پیدا کرتی تھی۔ اکثر عورتیں جانتی تھیں، آگا پیچھا نہ ہوتے ہوئے بھی کتنی ہی عورتیں صومیہ کو اس کی گوری رنگت کی بنا پر اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں اور کتنے نوجوان اپنی بیوی۔ حقیقت یہ تھی کہ سب کو خبر تھی، اس شہر میں اس بیوہ اور اس کی بچی کو لا بسانے کا ثواب کس کو جاتا تھا۔ ان بڑی بی جان کو جو مدینہ منورہ جا بسی تھیں کہ مرنا اب یہیں ہے۔ انھیں جب پتا چلا تھا کہ ایک بیوہ جو عیسائی سے مسلمان ہوئی تھی اور اس کی ایک بیٹی تھی اور بے یار و مددگار تو انھوں نے اپنے بیٹے سے پیسے بھجوائے تھے اور ان کے اس چھوٹے شہر میں رہنے کا انتظام کیا تھا جہاں خرچہ کم تھا اور آمنہ کو پڑھانے کے لیے زیادہ لڑکیاں مل جاتیں۔

آمنہ نے خالہ کا شکریہ ادا کیا کہ کیسے انھوں نے اور شمیمہ نے وقت نہ ہوتے ہوئے بھی انھیں یاد رکھا تھا۔ کھانے کی تعریف کے بعد اس نے کہا، ''جی تو چاہ رہا ہے یہاں آدھی رات تک بیٹھوں لیکن صبح صومیہ کا کولج ہے۔''

خالہ رکشا منگوانے کو ہوئیں لیکن آمنہ نے کہا، ''اتنی اچھی رات ہے، ہمارا ارادہ پیدل جانے کا ہے۔'' اور خدا حافظ کے بعد دونوں چل پڑیں۔

''واقعی ہوا بہت اچھی ہے۔'' کلیرس نے کہا۔

''مما! اب میں بات شروع کروں۔'' جیور جیانا نے کہا۔

''جلدی کیا ہے۔ میرا جی چاہ رہا ہے راستے میں روشن آرا باغ پڑتا ہے وہاں چل کر بیٹھیں۔''

''چلیے۔'' جیور جیانا نے بے دلی سے کہا۔

دونوں باغ میں داخل ہوئیں جو لگتا تھا ایک ریگستان میں چھوٹا سا نخلستان ہے کیوں کہ

اس کے چاروں طرف پکی سڑکیں، ٹریفک اور حادثوں کی دنیا تھی۔ تین چار جگہ کھجور کے درخت تھے جن کے اردگرد ریت تھی۔ ایک دو درخت ابھی چھوٹے تھے اور لگتا تھا اپنے ماں باپ کی انگلی پکڑے کھڑے ہیں۔ دور پودوں میں سے خوش بو آ رہی تھی لیکن پھول نظر نہیں آ رہے تھے۔ پورا چاند دھیمے دھیمے بچے کی چال آسمان پر چڑھ رہا تھا۔ لگتا تھا گھاس پر چاندنی بُرک دی گئی ہے۔ باغ کے چاروں طرف دیوار تھی اور ایک جگہ پھاٹک جس کے پاس چوکی دار سیمنٹ موزائک کی بنچ پر بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ آنے والی عورتیں اور لڑکیاں سورج ڈوبتے ہی رخصت ہو چکی تھیں اور باغ میں سناٹا تھا۔

''مما! آپ کو معلوم ہے میں کتنی امپورٹنٹ بات آپ سے اتنے دن سے کرنا چاہ رہی ہوں؟''

''جانتی ہوں۔'' کلیرس نے کہا۔ ''لیکن تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ میں اس کام کے سختی سے خلاف ہوں۔ جانتی ہوں، اس میں تمھاری بربادی ہے۔''

''وہ کیسے؟'' جیور جیانا نے کہا۔

''تمھاری خودداری ختم ہو جائے گی۔''

''سچ؟ کیسے؟''

''بہتر یہ ہوگا، مجھ سے ابھی اس معاملے میں رائے مت لو، جب چوبیس سال کی ہو جانا تب خود فیصلہ کرنا۔''

''کیا؟''

''کہ واقعی ایک لڑکی کا شادی کے بکھیڑوں میں پھنسنا ضروری ہے؟''

''ضروری نہیں ہے...! اتنی سی بات آپ نے پہلے ہی دن مجھے کیوں نہیں بتا دی تھی؟ میں اس کے بعد اس کے سلام کا جواب دیتی نہ اس سے بات کرتی اور اب تو وہ اپنے ماں باپ کو کولج لا کر مجھ سے ملا بھی چکا ہے۔''

''اور میں ان لوگوں سے نہیں ملنا چاہتی، نہ صمد کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمھیں یاد ہے جب تم چھوٹی سی تھیں، جب ہم اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے

جہاں ایک ڈاکٹر فتح آتا تھا اور جہاں میں نے ایک رکشے والے کو دھتکار دیا تھا، تم نے ایک دن مجھ سے کہا تھا ہمارے گھر میں کسی مرد کو نہیں آنا چاہیے، نہ مما آپ کسی مرد سے آئندہ بات کیجیے گا، نہ میں۔ چاہے کتنی بھی بڑی ہو جاؤں، کسی لڑکے سے بات نہیں کروں گی۔''

''اوہ مما، آپ بھی کس زمانے کی باتیں کر رہی ہیں۔ جب مجھے ان باتوں کی سمجھ تھی؟''

''جب تھی، اب نہیں ہے۔''

جیور جیانا رونے لگی۔

گیٹ مین کی آواز گونجی ''گیٹ بند کرنے کا وقت ہو گیا۔'' دو ایک پیچھے رہ جانے والی لڑکیاں عورتیں باہر نکلیں جنھیں اتنی دیر میں نہ کلیرس نے دیکھا تھا نہ جیور جیانا نے۔ ماں بیٹی اٹھ کر گھر کی طرف چل پڑیں۔ باہر جاتے ہوئے کلیرس نے گیٹ مین کو دو روپے دیے۔

صحن میں بیری کا درخت چاندنی میں سو رہا تھا۔ کلیرس جیور جیانا کو غسل خانے میں لے گئی اور اس کے منھ پر پانی کے چھپکے مارنے لگی۔

جیور جیانا نے پوچھا، ''مما یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟''

''اپنی بے بی جیور جی کا منھ دھلا رہی ہوں، جیسے بلی اپنے بچے کا منھ دھلاتی ہے۔''

جیور جیانا ہنس پڑی۔

غسل خانے سے باہر نکل کر کلیرس نے کہا، ''صبح تم مجھے کوفی پلانا چاہ رہی تھیں، اب میں اپنی معصوم بیٹی کو کوفی پلاؤں گی۔ پھر ہم بات کریں گے، شادی کے بارے میں، تمھاری شادی کے بارے میں، اور کچھ میری شادی کے بارے میں، پھر تم خود فیصلہ کر لینا۔ میں تو خاصی بیمار ذہن کی عورت ہوں جیسے کسی کو بچپن میں ریڑھ کی ہڈی کی ٹی بی ہو جائے تو سدا کے لیے کبڑا بن جاتا ہے، جن بچوں کے ذہن اور روح کو ٹی بی لگی ہو وہ بڑے ہو کر بھی اندر سے بیمار رہتے ہیں۔''

جیور جیانا بستر پر لیٹ گئی۔ کیتلی چولھے پر چڑھا کر کلیرس نماز پڑھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد کوفی پیتے ہوئے کلیرس نے کہا، ''تمھیں سب کچھ معلوم ہے۔ میرے نانا چارلس پٹھان تھے، عیسائی پٹھان، فرنٹیئر کے۔ میری نانی میری کوئٹہ کی تھیں، پٹھان، عیسائی پٹھان۔ وہ لوگ گورے چٹے تھے، وہاں کے نہیں جہاں کے اس ملک کے زیادہ تر عیسائی ہیں...

کالے عیسائی۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میری نانی بھی گوری تھیں اور ہزاروں ان سے شادی کرنا چاہتے ہوں گے۔ دونوں کی ملاقات کوئٹہ میں ہوئی۔ ذات تو عیسائیوں میں ہوتی نہیں، دونوں پروٹسٹنٹ تھے یا شاید نانی کیتھولک تھیں۔ رنگت میں برابری کی وجہ سے شادی میں کہاں جھر مجر ہوسکتی تھی۔ شادی ہوئی لیکن جلد ہی نانا چل بسے اور افسوس نانی کے لیے کچھ زیادہ چھوڑ کر نہیں مرے۔

''میری ماں کا نام ڈیفنی نہ جانے کس نے رکھا تھا؟ دادا، دادی والوں کو میں نہیں جانتی۔ نانی کے بیوہ ہوجانے کے بعد میری ماں پیدا ہوئیں۔ نانی مختلف گھرانوں میں چھوٹی چھوٹی تنخواہ پر کام کرتی رہیں، میری ماں چرچ کے اسکول جاتی تھیں۔ پھر...'' کلیرس نے ایک پھنکارے کے ساتھ کہا۔

''پھر؟'' جیور جیانا نے بے دلی سے کہا۔

''پھر نانی کو ایک غیر ملکی سفید آدمی کے گھر کو سنبھالنے کا موقع ملا۔ وہ اس وقت تک ادھیڑ ہوچکی تھیں۔ میری ماں کے جسم میں بھی تبدیلیاں آنی شروع ہوئی تھیں، یوں بھی پٹھان لڑکیاں جلد ہی جوان ہوجاتی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم نانی کو اپنے ماں باپ کے گھر کتنا سکھ ملا تھا اور ان کے شوہر جیسے تھے یعنی مسٹر چارلس آف فرنٹیئر پروونس، تمھیں بتا ہی چکی ہوں۔ جو نوکریاں مل جاتی تھیں انھی پر وہ خوش تھیں۔ بچے کو اگر پیٹ بھر کے کھانا مل رہا ہے تو اس کی باقی خوشی ماں کا چہرہ ہوتا ہے۔ میری ماں خوش تھیں، اس لیے کہ نانی خوش تھیں۔''

''ڈیفنی؟'' جیور جیانا نے کہا۔

''یس۔'' ایک منٹ کے لیے کلیرس چپ ہوگئی جیسے اپنی یادداشت کے ذخیرے کو درستی سے لگا رہی ہو۔

''آپ سوچ رہی ہیں کیا بتانا ہے کیا نہیں بتانا ہے۔'' جیور جیانا نے چھیڑنے والے انداز سے کہا۔

''اوہ، تم سے میں کچھ نہیں چھپا سکتی۔ لیکن تم اتنا مجھ پر احسان کرنا، اپنے بارے میں

سب کچھ مجھے کبھی نہیں بتانا۔تم بڑی ہوچکی ہو، اب جو زندگی میں آئے گا، خدا نہ کرے لیکن وہ ہوگا تکلیف سے بھرا۔اسے میرے کانوں میں مت ڈالنا۔''

''مارٹن انجینئر تھا، کسی بڑے پروجیکٹ کا انجینئر، غالباً انگریز۔آنے کے کچھ ہی دن بعد کسی کے کہنے سے مارٹن نے میری کو ملازم رکھ لیا۔''

''آپ کی نانی کو؟''

''ہاں جانتی تو ہو۔''

''نہیں مما میں نہیں جانتی۔آپ کی کہانی میں کردار اتنے ہیں کہ سب کے نام یاد رکھنا میرے لیے مشکل ہے۔لگتا ہے میں کوئی فرنچ یا رشین ناول پڑھ رہی ہوں۔''

''مارٹن نے نہ صرف گھر کو بلکہ خود کو بھی میری کے سپرد کر دیا۔کیا پکے گا؟ کون سے کپڑے رد کر دیے جانے کے لائق ہو گئے ہیں؟ کن نئے برتنوں کی ضرورت ہے؟ کون کون سا سوٹ ڈرائی کلیننگ کے لیے جانا ہے وغیرہ اور ایسے ہی غیر اہم چھوٹے چھوٹے کام۔

مارٹن کے کام پر جانے کے بعد ماں بیٹی... میری اور ڈیفنی... گھر میں اکیلی ہوتی تھیں۔ انھیں کمرہ بھی اپنی پسند کا آرام دہ ملا تھا اور لاؤنج وغیرہ کو استعمال کرنے کی انھیں کھلی آزادی تھی۔دوپہر کا کھانا مارٹن گھر پر کم ہی کھاتا تھا اور جب گھر پر کھانا ہوتو فون کر دیتا تھا لیکن اگر گھر آکر بھی اسے کھانے کا انتظار کرنا پڑے تو برا نہیں مانتا تھا۔

پہلے ماں بیٹی، جب گھر پر مارٹن نہ ہو ٹیلی وژن دیکھتی تھیں، بعد میں وہ بھی ان کے ساتھ آبیٹھتا تھا یا اگر وہ ٹیلی وژن دیکھ رہا ہوتو ڈیفنی وہاں جا بیٹھتی تھی، میری نہیں۔

پھر بغیر کسی پروگرام بتائے ہوئے کے، پہلے جو کام نانی کرتی تھیں، میری ماں ہنسی خوشی کرنے لگیں۔

''یعنی؟''

''بیڈ ٹی لے جانا۔''

''او۔'' جیورجیانا کے منہ سے چونک کر نکلا۔اس کی یہ آواز بڑی لمبی تھی جیسے خطرہ اس نے بھانپ لیا تھا۔

''پھر ایک دن نانی نے ماں سے پوچھا... یعنی میری نے ڈیفنی سے... 'کون سا مہینہ ہے؟...' 'دوسرا یا تیسرا۔' ماں نے کہا ہوگا۔

اسی شام ٹیلی وژن دیکھتے ہوئے نانی نے مارٹن سے کہا، 'مجھے تمھارے اور ڈیفنی کے بیچ میں بولنے کا ابھی اختیار ہے کیوں کہ ابھی اس کی عمر کم ہے اور اس کا آئڈین ٹیٹی کارڈ☆ نہیں بنا ہے۔' 'او مما ڈیئر...' اس نے انھیں کندھوں سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا، 'وہ میری بیوی بنے گی۔' پہلی بار مارٹن نے مما کو بجائے میز چارلس کہنے کے مما کہا تھا۔

میرا خیال ہے، وہ زمانہ نانی اور میری ماں کی زندگی کا خوب صورت ترین زمانہ تھا۔ اس نے دونوں کو تحفوں سے لاد دیا۔ کرچین کمیونٹی کی ساری عورتیں کہتی تھیں، 'میری نے اچھا نہیں کیا۔ ایک دن اس کی بیٹی بغیر شوہر کی ماں بنے گی۔'

اور یہی ہوا۔ مارٹن نے ایک دن بتایا، اسے یوگنڈا بھیجا جا رہا ہے۔ کوئی بڑا پروجیکٹ ہے۔ وہ پورا گھر میری پر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہاں جہاں کام تھا، اس علاقے میں عورتوں کے رہنے کا انتظام نہیں تھا۔ پروجیکٹ ختم ہوتے ہی وہ واپس آکر دونوں کو اپنے ملک لے جائے گا۔ تب تک انھیں اسی بڑے مکان میں رہنا تھا جس کا سال بھر کا کرایہ کمپنی ادا کر چکی تھی۔

کچھ عرصے تک مارٹن میری کو رقم بھی بھیجتا رہا لیکن خط نہیں آتے تھے۔ پھر رقم کا باقاعدگی سے آنا بند ہوگیا۔ جب میں پیدا ہوئی، وہ گھر ماں بیٹی سے لے لیا گیا تھا۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو ہم ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے جہاں کی سجانے کی چیزوں کے بارے میں جب میں سوچتی ہوں ہنسی آتی ہے۔ کھڑکیوں دروازوں پر پردے نہیں لگے تھے لیکن شراب سرو کرنے کے ڈی کینٹرز☆☆ کرسٹل کے جگ اور گلاس، ڈنر سیٹ، کوفی سیٹ نظر آتے تھے جیسے پینے پلانے کے سوا ہم اور کچھ کرتے ہی نہیں تھے۔ باقی آسانی سے بک جانے والا سامان نانی اور ماں بیچتی رہی تھیں۔ حقیقت میں پیسے کی شدید قلت کا سامنا نانی کو نہیں کرنا پڑا کیوں کہ بے قاعدگی سے ہی سہی مارٹن میری تعلیم کے لیے کچھ نہ کچھ بھیجتا رہتا تھا۔ نانی کی موت پر بھی اس کا تعزیتی خط آیا تھا۔ اس کا کوئی مستقل پتا نہیں تھا اور آخر میں جو خط آیا اس میں میری

☆۔ Identity Card ☆☆۔ decanters

ماں سے معافی مانگی تھی اور اپنی نادیدہ بیٹی یعنی مجھ سے بھی۔ بڑا درد بھرا خط تھا۔ لکھا تھا، میں نے یہاں آکر ایک سفید عورت سے شادی کر لی تھی اور اب وہ ہی میری دیکھ بھال کرتی ہے۔ شوقیہ جہاز اڑانے میں مجھے بہت بڑا حادثہ پیش آیا۔ رانوں اور کولھے کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ میں سمجھتا ہوں جو تمھارے اور کلیرس کے ساتھ میں نے کیا، یہ اس کی سزا ہے۔ میری کو بھی میری ذات سے بڑا دکھ پہنچا۔ کاش میں تمھیں یہاں بلا سکتا۔ لیکن کس حیثیت سے؟ میری تو یہاں پہلے ہی ایک بیوی ہے اور آمدنی کچھ بھی نہیں۔

اس کے بعد چند ماہ تک باقاعدگی سے اس کا بھیجا ہوا ڈرافٹ ہمیں ملتا رہا جیسے اپنے گناہ کا ازالہ کر رہا ہو۔ پھر پانچ چھ ماہ کے بعد ایک دو لائن کا خط مجھے ملا جس میں لکھا تھا، تمھیں گہرے افسوس کے ساتھ یہ خبر سناتی ہوں کہ ڈیئر مارٹن اس دنیوی زندگی کو ۳۰ر اپریل کو خدا حافظ کر گیا۔ اپنی ماں کو بھی یہ خبر سنا دینا، اس کی قبر... خیر یہ جان کر کیا کرو گی۔

خط کی پیشانی پر بول پوائنٹ سے صلیب بنائی گئی تھی۔ بس دو لکیریں، ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی۔''

کلیرس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ بولی، ''اس کی بے وفائی میں بھی میرے لیے دل کشی ہے۔''

دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر جیور جیانا اٹھی اور بولی، ''مما رات بہت ہو گئی ہے، آیئے سو جائیں۔''

''کل کولج مت جانا۔'' کلیرس نے کہا، ''جاؤ تھوڑی چائے بنا لاؤ۔ اس وقت میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا ہے، مجھے نیند نہیں آئے گی۔ میں اپنی بات کہہ لوں پھر تم کوئی فیصلہ کرنا۔ ڈرتی ہوں تم کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھو۔''

چائے بن جانے پر کلیرس نے دوبارہ بولنا شروع کیا، ''میں ماں کی زندگی میں پہلے مذہب سے برگشتہ ہوئی پھر مختلف مذہبوں کے بارے میں لائبریری سے لے لے کر کتابیں پڑھنے لگی۔ ایسا لگتا تھا میرے اندر کئی پشت کا خلا ہے جو شاید مذہب پُر کر دے اور واقعی ایک کتاب مجھے ایسی مل گئی۔ اس کے بعد کولج کی پڑھائی سے میرا جی اکتا گیا کیوں کہ مجھے معلوم

تھا، ہماری مالی حالت تعلیم کو کسی بھی منزل پر ختم نہیں کرنے دے گی، اُدھر میں رہ جائے گی۔ بچی ہوئی فیس کی مدت کا اندازہ کر کے میں نے زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ حقیقت میں ان دنوں میں خود کو کہیں کا بھی نہیں پا رہی تھی نہ اُس کمیونٹی کی جس کی میری ماں تھیں، نہ اس کی جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

ایک دن جب لائبریری کے ویسٹیبیول (vestibule) میں کھڑی میں نوٹس بورڈ پر لگائے ہوئے نئی کتابوں کے ڈسٹ کور پڑھ رہی تھی، کسی نے مجھے میرے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا، 'مجھے معلوم ہے آپ شاید پورے کولج میں سب سے زیادہ پڑھنے والی اسٹوڈنٹ ہیں۔'

میں نے پوچھا، 'آپ کو کس نے بتایا؟'

اس نے کہا، 'مسز ولسن نے۔' مسز ولسن کتابیں اشو کرنے کا کام کرتی تھیں۔

میں نے کہا، 'آپ سے وہ ایسی غیر ضروری باتیں بھی کرتی ہیں؟'

وہ بولا، 'نہیں میں نے آپ کو ایک دن کتابیں لے جاتے دیکھ کر ان سے پوچھا تھا یہ صاحبہ کس طرح کی کتابیں پڑھتی ہیں؟ انھوں نے ناک چڑھا کر کہا مذہبی۔ میں نے کہا، وہ تو سائنس اسٹوڈنٹ ہیں۔ انھوں نے کہا فی الحال تو وہ کتابیں پڑھ پڑھ کر مسلمان ہوئی جا رہی ہیں۔'

اس کے بعد کی منزلیں طے کرنے میں ہمیں زیادہ وقت نہیں لگا۔

جب میں نے ماں کو بتایا، میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں تو ہم میں بڑی گرما گرمی ہوئی تھی۔ لیکن وہ عیسائی ہوتے ہوئے بھی فادر، سن اور ہولی گوسٹ☆ سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی تھیں اور میں مذہبی بحث کے اسلحے سے لیس تھی۔ میرے مسلمان ہوجانے کے بعد اس گھر میں میرا رہنا دشوار ہوگیا۔

''وہ لڑکا حمزہ تھا۔ اسے میں نے سب بتا دیا میرے دماغ پر کون کون مذہبی جراحی کر رہا تھا۔ ایک کیتھولک پریسٹ کئی بار مجھ سے ملنے آیا۔ ایک پروٹسٹنٹ خاتون جو ایڈونٹسٹ☆☆ تھیں، ڈھونڈتی ڈھانڈتی میرے پاس کولج میں آئیں اور کہا، 'آپ میرے شوہر سے مل لیجیے، وہ

☆۔ Father, Son and Holy Ghost

☆☆۔ Adventist

ڈاکٹر آف ڈی وی نٹی (Dr. of Divinity) ہیں۔ آپ کے ہر سوال کا جواب دیں گے،' لیکن میں ان کی بات کو ٹال گئی۔ اس طرح کے اور بہت سے تھے۔

جب یہ بات میں نے حمزہ کو بتائی تو اس نے کہا، 'آپ مجھ سے شادی کر لیجیے پھر کوئی آپ کے دماغ پر مذہبی سرجری نہیں کرے گا۔'

اگلے دن وہ اور میں کورٹ گئے اور وہ میرا سامان سمیٹنے کے لیے گھر بھی آیا لیکن مما نے اس سے بات نہیں کی۔

حمزہ پیسے والا آدمی تھا، شاید کولج میں مجھ سے چار سال آگے ہوگا اور اس نے مجھے کولج چھوڑتے وقت دیکھا ہوگا جب میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوئی تھی۔ لیکن شادی کے وقت وہ گورنمنٹ سرونٹ تھا۔ اس نے نہ مجھے اپنی ماں سے ملایا نہ باپ سے کیوں کہ اس کی کہیں بچپن کی منگنی تھی، اپنی سے بڑی عمر کی عورت سے، اور مجھ سے شادی کر کے اُس نے اپنے گھر والوں کو خاندان میں منھ دکھانے کے لائق نہیں رکھا تھا۔ وہ لوگ زمیں دار تھے۔

''کورٹ سے وہ مجھے ایک ہوٹل کے کمرے میں لے گیا۔ پھر اس نے وہ فلیٹ لے لیا جس میں تم پیدا ہوئی تھیں۔''

''فلیٹ میں؟'' جیور جیانا نے پوچھا۔

''نہیں فلیٹ کے زمانے میں۔ پیدا ہوئی تھیں تم ہوسپٹل میں۔''

دبے لفظوں میں جیور جیانا نے پوچھا، ''پپا نے شادی میرے on the way ہونے کی خبر☆ سن کر کی تھی؟''

''نہیں۔'' کلیرس نے بے توجہی سے کہا۔

''وہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتا تھا، تمھاری پیدائش سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ ہم دونوں نے مل کر فلیٹ کو آراستہ کیا تھا اور اپنی زندگیوں کو بھی ایک دوسرے کے ساتھ آراستہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن نوجوانی میں دو مختلف جنس کی ہستیوں میں جو ایک دوسرے کے لیے شدید چاہ ہوتی ہے اس میں یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ محض جنسی کشش ہے

☆۔ میری آمد کی خبر، ولادت سے پہلے

یا محبت اپنے تمام تر معنی میں۔ زندگی ایک ساتھ گزارنے کا عزم، اپنا تمام آرام وقت پڑنے پر ایک دوسرے کے لیے تج دینے کو تیار رہنا، بغیر راہ میں کہیں ڈگمگائے کیوں کہ اس طرح کی محبت بھی شرک کو گوارا نہیں کرتی ہے۔

''میں نے بہت جلد جان لیا تھا، وہ بیتا ہے اور اسلام سے اس کی محبت مجھے حاصل کر لینے کے لیے تھی، اس میں گہرائی نہیں تھی۔

اکثر مجھے لگتا تھا وہ کسی اور عورت کے پاس سے اٹھ کر میرے پاس آ گیا ہے کیوں کہ جو خوش بو اس کے کپڑوں سے آتی تھی وہ عورتوں والی پرفیوم تو ہوتی تھی لیکن میری نہیں۔

''پہلے وہ روز فلیٹ میں آتا تھا اور جاتے ہوئے میرے پاس خرچ کے لیے سو دو سو روپے بھی چھوڑ جاتا تھا۔ پھر اس کا آنا کم ہوتا گیا۔ اسے میرا نماز پڑھنا بھی پسند نہیں تھا، بالخصوص صبح کی اور رات کی۔ وہ قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا، نہ اسے قرآن کی چھوٹی سورتیں یاد تھیں، جنھیں نماز میں پڑھتا۔ رمضان اس کی موجودگی میں کئی بار آئے لیکن وہ میرے روزے رکھنے تک سے خوش نہیں ہوتا تھا۔ تعلقات کے ختم ہو جانے سے پہلے اس نے ان چیزوں کو جہالت کی یادگار کہنا شروع کر دیا تھا۔ میں جانتی تھی مذہب کوئی سا بھی ہو، اس کے ماننے والے چالیس سے پہلے کم ہی اس پر توجہ دیتے ہیں۔ وہ بھی چالیس سے کم کا تھا اور مجھے امید تھی عمر کے ساتھ بدل جائے گا اس لیے میں اس کی باتوں کا زیادہ برا نہیں مانتی تھی۔

''جب تم چار برس کی ہوں گی، اس نے مجھ سے کہا تھا، 'یہ تم کیا صبح شام فرش پر ٹکریں مارا کرتی ہو۔' میرے منھ سے نکلا، 'اسے تم ٹکریں مارنا کہتے ہو، یہ سجدے ہی ہیں جو انسان کو انسان بنائے رکھتے ہیں، ورنہ وہ فرعون بن جاتا ہے، کسی کے سامنے بھی خود کو جواب دہ نہیں سمجھتا یا دوسرے فرعونوں کو سجدے کرنے لگتا ہے۔'

''اس نے پہلی بار مجھے گالی دے کر کہا، 'اب اگر ٹکریں مارتے دیکھا تو اتنے زور سے تمھارا سر زمین سے ٹکراؤں گا کہ پھٹ جائے۔ میری ماں، بہن، خالائیں، پھوپھیاں کوئی نماز نہیں پڑھتی ہیں، کیا تم ان سے بڑھ کر ہو؟'

اُس رات اس نے کھانا بھی نہیں کھایا اور حالاں کہ آیا سونے کے ارادے سے تھا لیکن

فوراً ہی چلا گیا۔ اب بھی اس کا دروازے کو غصے سے بھیڑ کر جانا کبھی کبھی میرے کانوں میں گونج جاتا ہے۔

''کئی دن تک وہ نہیں آیا اور جب ایک رات کوئی دیر سے آیا تو اس کے ساتھ ایک کم عمر عورت تھی۔ اس نے پارلر میں بیٹھ کر اس عورت سے کہا، بیٹھ جاؤ اور مجھ سے کہا، 'میرے دوست کی بیوی ہیں، کھانا کھا کر انھیں چھوڑنے جاؤں گا۔'

''مجھے ہکا بکا دیکھ کر اس نے مجھ پر آنکھیں نکالیں۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت گھر میں کھانے کے لیے صرف پیاز آلو کی بچی ہوئی ترکاری تھی، دو ایک ٹماٹر، تھوڑا سا مکھن اور آدھی ڈبل روٹی۔ میں نے کہا، آپ کی مہمان کی تواضع کس چیز سے کروں، آتے تو...'

اس نے میری بات کاٹ کر میز کی طرف اشارہ کیا جہاں دو لنچ بکس رکھے تھے۔ پھر اس نے اپنے لباس میں سے کہیں سے اسکوچ کی بوتل نکالی اور میری طرف دیکھا۔ میں احتیاطاً دو گلاس لے آئی اور آئس کیوبز۔

اس نے پوچھا، جیور جی سو رہی ہے؟ میں نے کہا، جی۔ اس نے اطمینان سے وسکی انڈیلی، اس میں پانی ملایا اور اس دوست کی بیوی سے پوچھا، تمھارے لیے بھی؟ اس نے کہا، نہیں،'' پھر اس نے فرائڈ چکن اور پٹیٹوز ڈبے سے نکالے اور کھانے لگا۔ وہ عورت خاموش بیٹھی رہی۔ میں دروازے سے لگی کھڑی تھی۔

''تقریباً دو گھنٹے بعد وہ اٹھا اور اٹھ کر ہمارے بیڈ روم میں گیا اور مجھ سے کہا، 'جیور جی کو اس کے کمرے میں چھوڑ آؤ'

''میرا دماغ اس وقت کام کرنا چھوڑ چکا تھا اور اٹومیٹن☆ کی طرح میں نے تم سوئی ہوئی کو تمھارے کمرے میں پہنچا دیا۔ شاید تین چار منٹ تمھیں تھپکیاں دینے میں لگے ہوں گے۔ جب میں لوٹی تو وہ بیٹھنے کے کمرے میں نہیں تھا اور اپنے ساتھ اس غیر عورت کو بھی ہمارے بیڈ روم میں لے گیا تھا۔

میرے وہاں پہنچنے پر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں نے گھبرا کر کہا، 'یہ آپ کیا

☆۔ Automaton (خودکار مشین)

کرر ہے ہیں۔'

اس نے کہا،' جو کر رہا ہوں دیکھ رہی ہو، دودھ پیتی بچی نہیں ہو۔'

''پھر اس نے اس عورت کو ہمارے بیڈ پر زبردستی لٹا دیا حالاں کہ وہ خود اس کی اس حرکت پر ہکا بکا ہوگئی تھی۔ مگر اس کی حالت مجھ سے بہتر تھی۔ اس نے مرد کو اس کے ہر رنگ میں دیکھا ہوگا اور سب کچھ بے دلی اور کبھی کبھی خوش دلی سے سہا ہوگا۔ میرا خیال ہے وہ عورت، عورت کی بنیادی شکل تھی، سب کچھ سہنے کے لیے ہر وقت تیار۔

حمزہ بولا،' آج تمھیں اس بات کا مزہ چکھاؤں گا کہ اصل سجدہ کیا ہے؟ تم نے میری بے عزتی کی تھی۔'

وہ عورت مری ہوئی آواز میں بولی،' مگر اس طرح تو آپ میری بھی بے عزتی کر رہے ہیں۔'

حمزہ نے غرا کر پوچھا،' کیسے؟'

'اس نے کہا، اُس طرح تو ہمارے یہاں بھی نہیں ہوتا ہے۔'

حمزہ نے کہا،' تم ٹکے ٹکے کی عورتوں، کوئی چیز تمھارے یہاں بھی ہے! you are cultureless people.'☆

وہ عورت بستر پر پھینکی ضرور گئی تھی لیکن magnetic doll☆☆ کی طرح ایک ہی ثانیے میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم تینوں میں دھینگا مشتی ہونے لگی۔ میں نے کئی بار کہا،' خدا کے لیے، میں تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں، یہ ظلم مت کرو۔' میں بری طرح رو رہی تھی۔ وہ عورت بھی روہانسو ہوگئی تھی۔

میں نے کہا،' اچھا مجھے دوسرے کمرے میں چلے جانے دو۔ لیکن خدا کے لیے، میں تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں، ایسا مت کرو۔'

میں جب دروازہ کھول رہی تھی، اس نے کھینچ کر مجھے اس سے جدا کیا اور اس عورت کے برابر میں لا کر پٹخ دیا۔

☆۔ تم وہ لوگ ہو جو تہذیب سے عاری ہیں۔ ☆☆۔ مقناطیسی گڑیا جو پھدک کر سرھانہ بدل لیتی ہے۔

''صبح میں اٹھ کر تمھارے کمرے میں آ گئی۔ ان دونوں کے بدن پر ایک دھاگا بھی نہیں تھا، وہ شراب کے نشے میں سو رہا تھا اور عورت تھک کر۔

میں نے تمھارے لیے ناشتا تیار کیا۔''

''مجھے یاد ہے۔'' جیور جیانا نے کہا۔

''دن چڑھے وہ اٹھا اور اپنا حلیہ درست کر کے بغیر مجھ سے کوئی بات کرے نیچے چل دیا۔ عورت اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ گھنٹوں مجھے انتظار رہا وہ اسے چھوڑنے گیا ہے اور واپس آ جائے گا لیکن وہ دوبارہ دیکھنے میں نہیں آیا۔

پھر مجھے سمجھانے والے آنے لگے۔ انھیں نہ جانے کیسے پتا چل گیا تھا کہ میں وہاں بے یار و مددگار پڑی تھی اور ان میں سے ایک سے میں نے سنا، ایک حمزہ، گورنمنٹ آفیسر اپنے گھر میں مردہ پایا گیا تھا۔''

٦

''عورت جب جوان ہوتی ہے اور اس کے قدرتی محافظ باپ، بھائی یا اگر بیاہتا ہے تو اس کا شوہر اس کے پاس نہ ہوں یا ہوں تو لیکن خود اس سے زیادہ کم زور ہوں تو اسے زندگی کی مصیبتیں جھیلنے میں مددگاروں کا انتظار نہیں کرنا پڑتا ہے۔

دونوں قسم کے مددگار، مرد بھی، عورتیں بھی، اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار رہتے ہیں۔

فتح بھی ان مددگاروں میں سے ایک تھا۔ تم میں کوئی تحفظ کی حس تھی جو اس کے پاس جانے سے روکتی تھی۔ ضرورت مندی نے میری اس حس کو کچل دیا ہوگا۔ حمزہ محبت کے چور دروازے سے میری زندگی میں داخل ہوا تھا۔ تم ان چور دروازوں پر ہمیشہ نظر رکھنا، غلطی سے شادی کر بیٹھا اور جلد ہی اس پر اپنی نیت کا راز کھل گیا کہ اسے عبادت گزار بیوی نہیں چاہیے تھی۔ اسے وہ بیوی چاہیے تھی جو جسمانی لطف کے نت نئے تجربوں میں اس کا ساتھ دے سکے، جو شادی کے پچیس تیس سال بعد بھی خود کو پرانی نہ ہونے دے۔ میں بیڈ روم کو سنیما ہاؤس نہیں

بنانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد مرد کے پاس ایک ہی ہتھیار رہ جاتا ہے۔ اپنی بیوی کو ذلیل کرنے کا، یا...''

''یا؟''

''اسے اپنی دوسری آمدنی کا ذریعہ بنانے کا۔

تمھیں یاد ہے جن دنوں ہم اس بڑے فلیٹ میں رہتے تھے، حمزہ کے ہمیں چھوڑ جانے کے بعد کچھ کرسچین عورتیں مجھ سے ملنے آئی تھیں؟''

''یاد ہے۔'' جیور جیانا نے کہا۔

''ان کی ہر بات تو خیر میرے لیے اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ سب کی طرح وہ بھی یہی سمجھ کر آئی تھیں کہ میں ایک مسلمان سے شادی کے لیے مسلمان ہوئی تھی اور اب جب شادی نہیں رہی تو میرے مسلمان نہ رہنے میں کیا قباحت تھی لیکن ان کے جانے کے بعد ان کی ایک بات میرے کان میں گونجتی رہی کہ حمزہ اپنے گھر میں مردہ پایا گیا اور وہ کچھ برے چکروں میں تھا۔ مجھے اس کے بارے میں عجیب وغریب خیالات آتے رہے۔ کس نے اس کی لاش کو پہلی بار پایا ہوگا؟ کس نے اس کے گھر والوں کو اطلاع دی ہوگی؟ شاید کبھی بعد میں مجھے اطلاع دی گئی ہو لیکن تب تک تو وہ بڑا فلیٹ میں چھوڑ چکی ہوں گی۔ اس کا پوسٹ مارٹم بھی ہوا ہوگا۔ اس وقت کتنا بے بس نظر آ رہا ہوگا، ویسا نہیں جیسا میں نے اس رات اسے دیکھا تھا، جب وہ ایک عورت کے ساتھ ہمارے فلیٹ میں سونے آیا تھا۔ ایک خیال میری مرضی کے خلاف میرے دماغ میں آیا تھا یا آنا چاہتا تھا، خیر اسے چھوڑو...''

''نہیں بتائیے۔''

''اندر سے وہ کیسا ہوگا، اس کا باہر تو میں نے دیکھا تھا۔ وہ کہاں دفن ہوا؟ آخر کو میرا شوہر تھا اور اس آخری بات سے جو بات پیدا ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ اگر میں اس کی بیوی تھی تو اس کے اثاثے مجھے ملنے چاہییں تھے، خواہ آخری ملاقات میں اس نے مجھ پر وہ ظلم کیا تھا جس سے بڑا ظلم کوئی مرد اپنی بیوی پر نہیں کرسکتا ہے۔ میرا ذہن یہ بھی کہہ رہا تھا یا کوئی عورت اپنے بے بس شوہر پر کرے۔

میں نے اِدھر اُدھر معلوم کیا کہ شوہر کے مرنے کے بعد کوئی عورت اگر دوسری شادی نہیں کرلیتی ہے تو اسے شوہر کے اثاثے میں سے کیا مل سکتا ہے؟

جس اسٹور سے میں روزمرہ کی ضرورت کا سامان لیتی تھی، اس کا مالک پڑھا لکھا شخص تھا... شاید بوہری تھا، وہ میری بات پر ہنسنے لگا اور بولا، 'اگر اس کا شوہر مر چکا ہے تو اس کا اثاثہ تو اس عورت کے قبضے میں ہوگا۔'

''میں نے کہا، 'لیکن میرے قبضے میں تو اس کی ایک چیز بھی نہیں ہے۔'

''اس نے شرمندگی سے 'سوری' کہا اور بولا، 'بینک میں رقم چھوڑی ہوگی یا انویسٹ منٹس ☆ میں۔'

''میں نے کہا، 'اسے حاصل کرنے کے لیے تو کاغذات چاہیے ہوں گے اور میرا شوہر تو ایک لونڈری کی رسید بھی چھوڑ کر نہیں مرا ہے کہ جا کر اس کے کپڑے اس لونڈری سے لے لوں جہاں وہ انھیں دُھلواتا ہوگا۔'

اسٹور میں کچھ خریداری کرنے والی عورتیں آ گئیں اور وہ ان سے باتیں کرنے لگا۔ میں گھر آ گئی۔ اگلی شام اسٹور میں مجھے ایک شخص ملا جسے دیکھنے پر مجھے خیال آیا، اسے تو کل بھی میں نے یہاں دیکھا تھا۔ آج دوبارہ نہ دیکھا ہوتا تو اس کی پہچان میرے ذہن میں نہ بنتی۔ اس نے مجھے دیکھ کر شناسائی کا سر ہلایا اور خریداری کرنے لگا۔

جب میں باہر نکلی تو وہ ذرا سینے کہہ کر میرے پاس آیا اور بولا، 'میرا خیال ہے جو پریشانی آپ کو ہے، اسے دور کرنے میں، میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔'

''میں نے کہا، 'کون سی پریشانی؟' اور اپنی راہ چل پڑی۔

''وہ میرے ساتھ کندھا ملا کر چلنے لگا اور بولا، 'میں ڈاکٹر ہوں، ڈاکٹر فتح یاب۔ آپ کی کل کی باتیں میرے کانوں میں پڑی تھیں۔ تھوڑا بہت میں حمزہ مرحوم کو بھی جانتا ہوں۔ ریلوے میں تھے، شاید انھوں نے خودکشی کی تھی۔ اسی لیے غالبًا کوئی وصیت چھوڑ کر نہیں مرے ورنہ آپ ان کے اثاثوں کے بارے میں اینجل بیکری کے مالک سے مشورہ نہیں کرتیں۔ آپ اس ہی سے

سامان خریدتی ہیں اور میں بھی۔ میں نے آپ کو اس دکان میں اکثر دیکھا ہے۔'

میں حیران بھی تھی پشیمان بھی اور طیش میں بھی۔ یہ آدمی ہے یا اخبار کا رپورٹر اور یہ غلطی میں نے کیوں کی کہ ایک پبلک جگہ پر اپنی مالی پریشانی کا ذکر لے بیٹھی جو دوسرے آدمی بھی سن رہے تھے، پھر وہ ہوتا کون تھا اپنی معلومات سے مجھے مرعوب کرنے والا۔ میں نے رک کر اس کے چہرے کو دیکھا، وہ اسٹیج ایکٹر تو لگتا تھا لیکن ڈاکٹر بالکل نہیں۔

میں نے کہا، 'معاف کیجیے بات اتنی بڑی نہیں کہ غیروں کو اس کے لیے تکلیف دیتی پھروں،' اور چل پڑی۔ وہ میرے ساتھ ساتھ آگے نہیں بڑھا۔ دو قدم پیچھے سے بولا، 'آپ کو بیوہ کی پنشن بھی ملے گی۔' پروویڈنٹ فنڈ بھی اور عدالت کے کاغذات مکمل ہوجانے پر آپ بینک سے رقم بھی نکلوا سکیں گی اور انویسٹ منٹس کو بھی کیش کرا سکیں گی۔'

''میں بات سنی اَن سنی کر کے اپنی راہ چلتی رہی۔ اس کا میرا پیچھا نہ کرنا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ کوئی چھچھورا آدمی نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے حمزہ کے جاننے والوں میں سے ہو۔ اور مجھ سے محض ہم دردی میں ملا ہو۔ گھر پہنچنے پر بھی اس کی باتیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔ بینک میں اس نے کچھ رقم چھوڑی ہوگی، اس کا مجھے یقین نہیں تھا۔ پروویڈنٹ فنڈ، پنشن، گریجویٹی وغیرہ زیادہ وزنی الفاظ تھے۔ ہمت بندھانے والے۔

دو ایک دن بعد وہ مجھے پھر اینجل بیکری میں نظر آیا۔ اس دفعہ اس پر سے میں نے اپنی نظر محض گزار نہیں دی۔ اسے اس میں شناسائی نظر آ گئی ہوگی۔ جب میں سامان لے چکی تو دُکان سے باہر نکل کر ایک چھن بھر کو ٹھہری۔ وہ آ کر میرے مقابل کھڑا ہوگیا اور بولا، 'کہیے کچھ کام بنا؟'

''میں نے کہا، ابھی تو نہیں۔ درخواست لکھ رہی ہوں کہ پنشن مجھے ملنے لگے کیوں کہ ایک میرا ہی نہیں حمزہ کی بیٹی کے لالن پالن اور تعلیم کا بھی سوال ہے۔

''اس نے ہم دردی سے کہا، 'یقیناً۔ مسز حمزہ، آپ مجھے کاغذات دکھائیں گی؟'

'کاغذات تو کچھ بھی نہیں ہیں۔'

'تو پھر بنانے پڑیں گے۔'

مجھے اس کا وہ جملہ ابھی تک یاد ہے، بنانے پڑیں گے۔''

’’اس میں کیا خاص بات ہے؟‘‘ جیور جیانا نے حیرت سے پوچھا۔

’’میں بھی یہ بات اس وقت نہیں سمجھی۔ بعد میں اس نے مجھ سے جعلی کاغذات بنانے میں مدد چاہی تھی اور جب میں نے منع کر دیا تو اس نے کہا تھا نئے سرے سے کاغذات بنوانے میں سال لگ جائیں گے۔ لیکن میں اپنی بات پر اڑی رہی کہ کوئی غیر قانونی کام میں نہیں کر سکتی۔

’’خیر، کاغذات کے بارے میں پوچھنے کو اگلی شام وہ میرے فلیٹ میں بیٹھا مجھ سے ساری باتیں تفصیل سے پوچھ رہا تھا، کہاں شادی ہوئی تھی؟ مہر کی رقم کیا تھی؟ کون سے بینک میں اس کا اکاؤنٹ تھا؟ تم کچھ دور کھڑی اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ اس نے چاہا تمھیں پاس بلا کر اپنی گود میں بٹھا لے مگر تم دور رہیں۔ شاید اس وقت بھی تمھیں اس کا ہمارے فلیٹ میں آنا پسند نہیں تھا۔

’’دوسری شام وہ میرے پاس زیادہ دیر بیٹھا لیکن میں اسے نہ چائے پلا سکتی تھی نہ کھانے کو کچھ اس کے سامنے رکھ سکتی تھی۔ اندھیرا ہو گیا تھا، اس نے اٹھ کر کچن میں جھانک کر دیکھا جہاں اسٹوو پر کچھ بھی نہیں پک رہا تھا۔ اس نے چونک کر پیچھے ہٹتے ہوئے سوری کہا اور ’ابھی آتا ہوں‘ کہہ کر نیچے چلا گیا۔

وہ میری زندگی کا وہ دور تھا کہ ٹیوشن اگر اس شرط پر ملتا کہ گھر آ کر پڑھاؤ تو میں اس کے لیے بھی تیار ہو جاتی اور فلیٹوں میں سے اگر کسی میں برتن مانجھنے، کپڑے دھونے کی ملازمت ملتی تو وہ بھی کر لیتی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ لوٹا تو اس کے پاس بہت سا سامان تھا جسے اس نے ایک ایک کر کے شوپنگ بیگ سے نکالا اور میز پر رکھ دیا۔ تم دور سے اس سامان کو دیکھتی رہیں لیکن تمھاری آنکھوں میں مطلق ندیدا پن نہیں تھا۔ اس نے چوکلیٹ بسکٹ تمھاری طرف بڑھاتے ہوئے تمھیں بلایا لیکن تم اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ ناچار اس نے بسکٹ میز پر رکھ دیے اور مجھ سے بولا، ’مسز حمزہ! اب آپ چائے بنائیے۔ چائے پی کر میں آئندہ کا پروگرام بناؤں گا۔ فی الحال تو مجھے بھوک لگی ہے۔‘

’’کچن میں چائے بناتے ہوئے مجھے شرم آ رہی تھی۔ میں خود اپنے گھر میں مہمان تھی۔

پر کیا کرتی، ہم دونوں صبح سے بھوکی تھیں اور اس نقاہت میں پنشن وغیرہ سے متعلق اس کی باتیں نہ میں سمجھ سکتی تھی نہ رائے دے سکتی تھی کہ کون سا ضروری کاغذ کہاں سے حاصل کیا جاسکتا ہے یا اس کا ملنا محال ہے۔

جب میں باہر آئی تو دیکھا اس نے کھانے کا سامان میز پر لگا دیا تھا...فرائڈ چکن، روٹی کے سلائس، ٹماٹو کیچ اَپ، ملک پیک، چینی وغیرہ۔

رات کو دس بجے اس کے جانے کے بعد میرے پچکارنے پر تم نے کھانے کو ہاتھ لگایا۔ ہم دونوں بھوکے تھے، کھا کر تم میری گردن میں بانہیں ڈال کر سو رہیں۔

اس کے بعد وہ باقاعدگی سے میرے پاس آنے لگا۔ میں نے یہ بات اس سے راز میں رکھی کہ شادی کا کورٹ کا کاغذ میرے پاس تھا اور اسے حمزہ ہی نے میرے پاس یہ کہہ کر رکھوایا تھا کہ اسے سنبھال کر رکھو۔ اگر میری غیر موجودگی میں کوئی آ کر دھمکی دے کہ میں تمھیں بھگا کر لایا ہوں تو دکھا سکتی ہو کہ دیکھو بھگا کر نہیں ڈنکے کی چوٹ پر لایا ہوں۔

ہر شخص زندگی میں کبھی نہ کبھی خود سے مصالحت کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ میرے نہ چاہتے ہوئے بھی آہستہ آہستہ فتح میرے گھر کا تیسرا فرد بن گیا۔ اس کی وجہ سے ضرورت کی جو چیزیں بک گئی تھیں پھر آنے لگیں، نئے میٹریس، تکیے، چادریں، غلاف، کھانے اور چائے کے برتن اور ناشتے کے لیے فروٹ جوس کے کارٹن، پنیر اور اوٹس۔☆

مجھے یقین تھا کہ اس کی پریکٹس جہاں بھی تھی بہت کامیاب تھی۔

تم میں اور اس میں ایک طرح کا بیر ہوگیا تھا۔

ان دنوں میں نے نماز پڑھنی چھوڑ دی تھی کیوں کہ میں خدا کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔

کچھ دن بعد وہ اس پر مصر ہونے لگا کہ مجھ سے شادی کرلو۔ میں بات کو ٹالتی رہی کیوں کہ مجھے خدشہ تھا کہ دوسری شادی ہوجانے کی صورت میں مجھے بیوہ کی پنشن سے ہاتھ دھونا پڑیں گے اور اگر اس کے بعد میرے نصیب میں کوئی پنشن تھی تو اس کے لیے فتح کو مرنا پڑے گا اور وہ بھی اس صورت میں کہ وہ گورنمنٹ ملازم تھا۔''

☆۔ Oats (دلیا)

جیور جیانا ہنس پڑی۔

''یہ کھیل بہت دن چلا۔ وہ مجھے بتاتا تھا، درخواست میں کیا لکھنا ہے؟ میں اسے ٹائپ کر کے اس کے حوالے کرتی تھی۔ وہ صبح کے ناشتے کے بعد جاتے ہوئے میری درخواست جمع کرانے کے لیے لیتا جاتا تھا۔ دو ایک بار مجھے اون اسٹیٹ سروس☆ کے لفافے میں ان درخواستوں کی رسید بھی ملی مگر بات اس سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔

وہ تقریباً روز آتا تھا، کھانا کھا کر رات وہیں گزارتا تھا۔ صبح گھنٹوں عورتوں کی طرح بنتا سنورتا تھا، ناشتا کرتا تھااور چلا جاتا تھا، گھر کا خرچہ چل رہا تھا۔

شروع کے دنوں میں وہ کئی بار تمھیں اور مجھے کھانا کھلانے کے لیے باہر لے گیا، پھر صرف مجھے اور بعد میں اس نے خرچہ دینے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ حالاں کہ میں کہتی تھی، میری پنشن ہوجانے دو جو خرچ تم کر رہے ہو اس کی ایک ایک پائی چکا دوں گی۔ وہ اس پر طنز سے ہنس دیتا تھا۔ ایک بار اس نے کہا، 'شروع ہوچکی... اگر اس وقت نکاح اور وراثت کے کاغذات بنا ڈالتیں تو کب کی پنشن شروع ہوچکی ہوتی، پروویڈنٹ فنڈ بھی مل گیا ہوتا اور گریجویٹی بھی۔'

''اب فتح پر بھی مجھے شک ہونے لگا تھا کہ فتح کے روپ میں دوسرا حمزہ پیدا ہوگیا ہے۔ اکثر وہ پیئے ہوتا تھا یا تمھارے اپنے بیڈروم میں چلے جانے کے بعد وھسکی کی بوتل نکال کر مجھ سے سوڈا طلب کرتا تھا۔ اس کا کہنا کہ 'دوست سوڈا تو گھر میں رکھا کرو' مجھے ناپسند تھا مگر کیا کرتی۔ اگر میں اس سے بے رُخی سے پیش آتی، وہ چلتا بنتا۔ پنشن کے جتنے کاغذات تھے وہ اس کے پاس تھے یعنی اگر وہ واقعی پنشن کے کاغذات تھے، اور ڈرتی تھی اسے کھو بیٹھنے کے بعد مجھے نئے سرے سے بنوانے پڑیں گے۔

نئے فلیٹ میں آنے کے کچھ دن بعد، بل ادا نہ کرنے کی وجہ سے بجلی کاٹ دی گئی تھی۔ میں جانتی تھی، ایک دن پانی اور گیس والے بھی مجھ سے انتقام لینے والے تھے۔ فتح کے آنے سے یہ سب خطرے ٹل گئے تھے اور جو پہلے زندگی میں نہیں تھا، وہ بھی آ گیا۔''

☆۔On State Service

''یعنی؟''

''ٹیلی فون۔ جس کی حقیقت میں مجھے ضرورت نہیں تھی لیکن اس نے لگوا دیا تھا کہ ہوسکتا ہے تمھیں مجھے ہی فون کرنا پڑ جائے لیکن اس نے اپنا فون نمبر مجھے کبھی نہیں دیا۔

میں نہیں جانتی تھی آگے جانے کے لیے زندگی کا کون سا دروازہ مجھ پر کھلا ہے اور وہ بھی ایسا کہ تمھیں ساتھ لے جاسکوں۔ فتح کی خودستائش سے مجھے نفرت تھی۔ اس کی سانس تک سے مجھے وحشت ہوتی تھی لیکن کیا کرتی کیوں کہ ہر کام اُدھر میں تھا اور میں اپنے جسم کو اس کے ہاتھوں گروی رکھ چکی تھی۔ سوچتی تھی، عدالت اور پنشن کے کام ہوچکیں تو اس کا شکریہ ادا کروں گی اور کہوں گی اب میں زندگی بغیر تمھارے سہارے کے بسر کرلوں گی۔ جاؤ سِدھارو خدا تمھیں سُدھارے۔''

جیورجیانا کے چہرے سے تناؤ ختم ہوگیا اور وہاں ایک مسکراہٹ کی لہر آئی اور گزر گئی۔

''یا ایک موہوم خود فریبی کہتی تھی، ہوسکتا ہے وہ میری وجہ سے بدل جائے اور میں اس سے شادی کرلوں۔

لیکن ایک دفعہ بھی میں نے دل میں اللہ سے یہ نہیں کہا، میں مذہب سے بھر پائی۔ کبھی اپنی گوری رنگت پر پچھتاتی تھی جس کی بنا پر اس ملک میں ان گنت لڑکیاں احمق، پیسے والے مردوں کے پلے پڑتی ہیں۔''

اس دفعہ جیورجیانا آواز سے ہنس پڑی۔

''ایک شام کئی دن کے بعد وہ بنا سنورا ہمارے فلیٹ میں آیا۔ لگتا تھا اس کا دماغ کہیں اور ہے۔ میں ڈرتی رہی تھی اگر وہ رات کے کھانے کے لیے رک گیا تو میں اس کی پسند کی چیزیں کہاں سے لاؤں گی؟ بغیر یہ دیکھے کہ تم وہیں تھیں، وہ مجھ سے بازاری لہجے میں بولا، 'یار شادی کا کب تک ارادہ ہے؟'

میں نے آنکھوں سے تمھاری طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا۔

وہ بے حیاؤں کی طرح ہمیشہ سے زیادہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔

'اسے بھی سب کچھ معلوم ہونا چاہیے۔'

'کیا؟' میں نے غصے سے کہا۔

'کہ آج نہ سہی کل تمھیں میری بیوی ہونا ہے۔'

''پھر اس نے جیب سے ایک لولی پوپ نکال کر تمھیں دکھاتے ہوئے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ تم اٹھ کر وہاں سے بھاگیں اور بھاگتے ہوئے وہ لولی پوپ اس نے تمھیں پھینک کر ماری۔

مجھے لگ رہا تھا، جیسے آج وہ ہاتھی کی طرح مست ہوگیا ہو اور زنجیریں تڑا کر بھاگا ہو۔

وہ دیر تک بے وجہ ہنستا رہا۔

اس کے اصرار کو کم کرنے کے لیے میں کہتی رہی، شادی تم ہی سے کروں گی، لیکن ابھی نہیں۔

'کورٹ میرج بھی نہیں؟'

''میں گھبرا گئی۔ کیا وہ مجھ پر ریسرچ کر کے آیا تھا؟ کیوں کہ اپنی کورٹ میرج کا ذکر میں نے اس سے نہیں کیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کورٹ میرج کے بعد بیوی کا شوہر کے انتقال سے ملنے والی پنشن پر حق نہ بنتا ہو اور مجھ پر دباؤ ڈالنے آیا تھا۔

''ایکا ایکی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میری طرف ہاتھ اٹھائے بڑھا جیسے تمام شرم و حیا کو خیر باد کہنا چاہتا ہو۔ میں نے ٹالنے کے لیے کہا، تم کچھ دیر آرام کرو، میں تمھارے لیے چائے بناتی ہوں۔ شاید تم تھک گئے ہو، کچھ دیر سو لو، اتنی دیر میں سپر[☆] تیار ہو جائے گا۔

وہ بولا 'باہر چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ، آج تمھاری دعوت ہے۔'

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

'جیور جی بھی ساتھ چلے گی؟' حالاں کہ میں جانتی تھی فتح کی اس ذہنی حالت میں جیور جی کو ساتھ لے جانا اس پر ظلم ہوگا۔

'نہیں بے بی نہیں۔' وہ تمھیں بے بی کہتا تھا اور اگر ہمارے راستے جدا نہ ہو جاتے اور وہ ساتھ رہ رہا ہوتا تو وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بچی کے جوان کیا چار بچوں کی ماں بن جانے پر

☆۔ Supper (رات کا کھانا)

بھی اسے بے بی کہتے ہیں۔''

جیور جیانا کو بے ساختہ ہنسی آ گئی اور بولی،''میں نے ایک چالیس سال کی بے بی دیکھی ہے۔ اپنے بچے کو چھوڑنے اسکول آتی تھی۔ ایک دن اس کے ساتھ کار میں بیٹھی ہوئی عورت نے اسے بے بی کہہ کر آواز دی۔ اس کے بعد تمام لڑکے اسے دیکھتے ہی بے بی کہنے لگے۔ پھر کچھ دن بعد بے بی کے بیٹے نے ہی اسکول آنا چھوڑ دیا۔''

''میں ڈر رہی تھی، وہ کورٹ میرج والی بات دوبارہ نہ شروع کر دے۔ فوراً تیار ہونے اندر چلی گئی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آیا۔ میں نے کہا،'بے صبرے مت بنو، تمھارے ساتھ ہی چل رہی ہوں۔'

''وہ باہر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا جن میں سے کبھی کبھی عجیب بدبو آتی تھی۔ ناک کو پھونک ڈالنے والی بدبو۔

دروازہ کھول کر میں نے تم سے کہا،'گھبرانا مت۔ ڈاکٹر فتح کی طبیعت آج ٹھیک نہیں ہے۔ میرا خیال ہے بخار ہے، دماغ کو چڑھ گیا ہے۔ انجکشن لگوا کر اسے اس کے گھر بھیج دوں گی اور خود جلد ہی لوٹ آؤں گی۔'

تم ڈری سہمی سی بیٹھی ہوئی تھیں اور میری بات کا پتا نہیں تم پر اثر ہوا یا نہیں۔

فلیٹ سے سڑک پر آ کر اس نے ٹیکسی لی اور میرے لیے تپاک سے اس کا دروازہ کھولا۔ پھر وہ ٹیکسی میں مجھ سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس کی اپنی کار ہمیشہ میں نے یہی سنا، ایک ایکسیڈنٹ کے بعد گیراج میں بن رہی تھی۔

ٹیکسی کی چھوٹی محدود فضا میں مجھے لگنے لگا، میرا سر گھوم رہا ہے۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں اور کار میں وہی بدبو دفعتاً بھر گئی جو کبھی کبھی اس کے سگریٹ سے کمرے میں بس جاتی تھی لیکن ایک کمرے میں جس کی کھڑکیاں کھلی ہوں اور بند کوٹھری میں بڑا فرق ہے۔ مجھے لگ رہا تھا میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔ مجھے تھوڑا تھوڑا یاد ہے، ڈرائیور نے گھوم کر اس سے کچھ کہا تھا۔ فتح نے سگریٹ اس کے حوالے کر دی۔ ڈرائیور نے آنکھ سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا اور فتح ہنس پڑا۔ میں نے فتح سے کہا،'خدا کے لیے شیشہ نیچے کر دو۔' جب

میرا دماغ کچھ سدھرا تو میں نے دیکھا، ایک پست سے روتے ہوئے علاقے میں پہنچ کر جہاں سڑکوں پر کہیں روشنی تھی کہیں نہیں، فتح نے ڈرائیور سے ایک دروازے پر ٹیکسی رکوائی۔ اسے کرایہ دیا، دروازہ کھول کر پہلے خود اترنے کو ہوا پھر مجھے بھی اسی دروازے سے ہاتھ پکڑ کر اتروایا جس سے خود اترا تھا۔

دستک دینے سے ایک ادھیڑ عمر کو پہنچی ہوئی عورت نے دروازہ کھولا اور جھجک کر ایک قدم پیچھے کو ہٹی۔ ہوسکتا ہے ادھیڑ عمر کی نہ ہو، اپنے انتہائی معمولی کپڑوں اور اُدھڑے ہوئے بالوں کی وجہ سے مجھے ایسی لگی تھی۔

میرا ہاتھ تھامے فتح کمرے میں داخل ہوا اور مجھے ایک صوفے میں ٹھونس کر عورت سے بولا 'یہ ہیں کلیرس، کلیرس حمزہ۔' اور عورت کی طرف اشارہ کرکے مجھ سے کہا، 'یہ ہے ممتاز، ممتاز فتح یاب، آج تمھاری میزبان۔'

''میں نے خوف زدہ ہوکر دروازے کی طرف دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنی رہائی کے لیے کچھ کرتی، اس نے دروازے کی چٹخنیاں چڑھا دیں اوپر بھی اور نیچے بھی، بیچ میں پیتل کا اوٹو میٹک بند ہونے والا تالا تھا۔

میں نہیں چاہتی تھی کہ اسے یہ اندازہ ہو کہ میں خوف زدہ ہوں اس لیے جھوٹے سکون سے بیٹھی رہی بلکہ اس عورت یعنی ممتاز سے میں نے بیٹھنے کے لیے کہا جو گم بودہ کھڑی اپنے دوپٹے کے ایک کونے کو انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔

کمرے کی ہر چیز سے پرانے پن کی بو آرہی تھی۔ دیواروں پر لگتا تھا پہلی قلعی کے بعد ھی چونے کا دوبارہ ہاتھ نہیں لگا تھا۔ صوفے دو تھے، ایک سائیڈ کا جس پر سوچ سمجھ کر میں بیٹھی ں۔ دوسرا تین آدمیوں کے بیٹھنے کا جس کے بیچوں بیچ فتح بیٹھا تھا۔ دوسرا سائیڈ کا صوفہ نہیں تھا۔ ں کا کپڑا اور دروازوں کے پردے ایک ہی گزرے ہوئے زمانے کا پتا دے رہے تھے۔ ں ہی کہیں کہیں سے پھٹے ہوئے تھے۔ معمولی سا قالین جو پٹھان پھیری والے سے خریدا گیا میرے پیروں تلے تھا، سروں پر اس کے بٹے ہوئے دھاگے نکل آئے تھے۔ چھوٹے فے کے برابر جس پر میں بیٹھی تھی، ایک بغیر کور کی میز تھی اور چند آسانی سے ٹوٹ جانے والی

گلاس کی سجانے کی چیزیں جنھیں گلاس مینجری☆ (glass managerie) میں ہونا چاہیے تھا لیکن ایک بچوں کے گھر میں چھوٹی سی نیچی میز پر نہیں، یعنی اس وقت میرا خیال تھا اس گھر میں بچے ہوں گے۔ دیواروں پر کئی جگہ چھپکلیاں چل رہی تھیں اور لگتا تھا بعض کے پیٹ انڈوں سے بھرے تھے۔ کمرے میں باہر سے تو اِکا دُکا آوازیں آ رہی تھیں لیکن مکان کے اندرونی حصے سے ایک بھی نہیں۔

فتح نے کہا، 'بیگم صاحبہ! آج میم صاحب کو آپ کے ہاتھ کا کھانا کھلانے لایا ہوں۔'

''اور جب وہ حیرت زدہ کھڑی رہی تو اس نے کہا، 'چل جا کے روٹی ڈال اور اپنی قسمت کی طرح اسے جلا مت ڈالیو۔' پھر میری طرف دیکھ کر اس نے کہا، 'اسے بس سونا آتا ہے۔'

''ممتاز گھبرا کر اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔

میں چپ بیٹھی قالین کو دیکھتی رہی کہ کہاں کہاں سے پھٹا تھا، ان سوراخوں میں سے نیچے کا فرش نظر آتا تھا اور میں نے فیصلہ کرلیا وہ نہ رنگین سیمنٹ کا تھا، نہ ٹائلز کا اور نہ موزائیک، صرف سیمنٹ کا تھا۔

اس نے اٹھ کر ریفریجریٹر کھولا جو اندر کھلنے والے دروازے کے الٹے ہاتھ پر کھڑا تھا اور اب مجھے اندازہ ہوا، تھوڑی تھوڑی دیر بعد مکان جو مجھے ہلتا ہوا لگتا تھا، وہ اسی کی گھڑگھڑاہٹ تھی۔ اس کے بعد وہ چپ ہوجاتا تھا جیسے کوئی بوڑھا جس کی سانس کی نالی سے بلغم ہٹ جانے کے بعد اسے سکون مل جاتا ہے۔ فتح نے ریفریجریٹر سے سوڈے کی بوتل نکالی، میز کو کھینچ کر ان ڈیڑھ صوفوں کے بیچ میں کیا اور اس پر بوتل رکھ دی۔ خود وہ میرے صوفے کے ہتھے پر بیٹھ گیا اور بولا 'تمھارے یہاں اس چیز کی کمی ہوتی ہے جس کے بغیر اسکوچ آبِ زم زم لگتی ہے۔' میں نے کہا، 'تہذیب سے کام لو۔' خلافِ توقع یہ کہتے ہوئے میری پیشانی پر بل پڑ گئے۔

'یعنی؟'

'زم زم قابلِ عزت چیز ہے جسے قابلِ عزت لوگوں کے منہ میں جانا چاہیے۔'

اس نے میرے پیچھے سے ہاتھ لے جا کر مجھے چپٹانا چاہا۔ میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ

☆۔ مصنوعی جانوروں کی سجاوٹ کے لیے ایک شیشے کا مکعب، حقیقت میں جنگلی جانوروں کی نمائش کا کٹہرا

ہنستا ہوا دوبارہ ریفریجریٹر کے پاس گیا، وہاں سے سوفٹ ڈرنک کی بوتل نکال کر لایا اور بولا، 'پرنسس آف گریٹ بریٹین!☆ آپ یہ پیجیے۔'

''پھر اوٹ پٹانگ طریقے سے بولا، 'میں نے ہائی اسکول کے زمانے میں ایک غزل پڑھی تھی، جس میں کچھ ایسی بات شاعر نے کہی تھی کہ رات کو پہلے زم زم پی کر اوپر سے شراب پی اور صبح اُٹھ کر احرام کے کپڑوں کو دھو ڈالا۔ پھر میرا خیال ہے سیدھے کندھے پر بیٹھے فرشتے نے الٹے کندھے پر بیٹھے فرشتے کا لکھا کاٹ دیا ہوگا۔'

ایکا ایکی اس نے اتنی زور سے آواز دی، 'ممتاز' کہ میں دہل گئی۔

ممتاز بھاگی ہوئی آئی، اب وہ پہلے سے بھی زیادہ بوڑھی لگ رہی تھی۔ واقعی بعض مردوں کو ان کی بیویاں اور بعض بیویوں کو ان کے مرد وقت سے پہلے بوڑھا کر دیتے ہیں۔''

جیور جیانا نے کہا، ''میں یاد رکھوں گی۔''

''کھانا تیار ہوا یا ابھی آٹا گوندھ رہی تھی؟'

'کچھ روٹیاں ڈال چکی ہوں، باقی جب ڈالوں گی جب آپ کھانے بیٹھ جائیں گے۔'

فتح نے مجھ سے کہا، 'دیکھا اسے ٹریننگ کہتے ہیں' اور ممتاز سے کہا، 'بس سمجھ لے یہیں کھانے بیٹھ گیا ہوں۔'

''ممتاز کھانا لگانے لگی۔ میں اٹھ کر اس کے ساتھ باورچی خانے میں چلی گئی اور اس کے منع کرنے پر بھی پلیٹیں، گلاس وغیرہ لے جا کر میز پر لگانے لگی۔

میں نے اس سے کہا، 'زیادہ روٹیاں مت ڈالو سسٹر مجھے بھوک نہیں ہے اور نہ کھاؤں گی۔'

پھر میں نے اس سے پوچھا، who are you my little sister☆☆ کیوں کہ نزدیک سے وہ مجھے خود سے عمر میں چھوٹی نظر آئی۔

اس نے کہا، 'میں میڈیکل اسٹوڈنٹ تھی جب فتح نے مجھ سے شادی کی تھی۔ پھر وہ اپنے وعدے سے کہ شادی کے بعد مجھے میڈیکل کولج جانے دے گا، پھر گیا۔'

''میری بھوک نہ ہونے والی بات سن کر فتح نے بیٹھنے کے کمرے سے کہا، 'اگر ایک پیگ

☆۔ Princess of Great Britain ☆☆۔ میری چھوٹی بہن، تم کون ہو؟

لے لیتیں تو بھوک لگ جاتی۔ ممتاز کے ساتھ مجھے یہی نسخہ آزمانا پڑتا ہے۔'

کچن میں ممتاز نے روہانسو ہوکر کہا، 'میں پیتی نہیں ہوں، یہ مار کر پلاتے ہیں۔'

Believe me I do not drink۔☆

وہ ممتاز کی طرف مارنے کو دوڑا۔ میں نے بیچ میں آکر کہا، 'خاموشی سے کھانا کھاؤ اور مجھے گھر چھوڑ کے آؤ۔'

'گھر؟ آج رات یہی تمھارا گھر ہے، تمھاری سسرال، ڈرائنگ تینوں ساتھ سوئیں گے۔ ایک طرف تم، ایک طرف یہ، بیچ میں میں۔'

ممتاز دروازے میں کھڑی رو رہی تھی۔

کھانے کے بعد میرے منع کرنے پر بھی وہ مجھے گھسیٹتا ہوا اپنے سونے کے کمرے میں لے گیا اور بیڈ پر دھکا دے کر ممتاز کی تلاش میں کمرے سے باہر نکلا۔ باہر سے اس کی اس کتے کی سی آواز آ رہی تھی جس کا گلا بھونک بھونک کر بیٹھ گیا ہو، بیچ بیچ میں گالیاں تھیں۔

'مائی بچز، مائی لولی بچز، آئی ول شو یو واٹ کیسانووا (Casanova) واز اِن رئیل لائف۔'☆☆

''ممتاز اپنی جگہ سے ہلی نہیں تھی، مستقل روئے جا رہی تھی۔ اس نے وہاں مضبوطی سے سلائڈنگ بولٹ کو پکڑ رکھا تھا اور اس کے منھ سے جو الفاظ نکل رہے تھے، مجھے ابھی تک یاد ہیں

'خدا کے لیے میں آپ کے پیر پکڑتی ہوں۔ خدا کے لیے یہ کام آپ میرے سامنے مت کیجیے اور جہاں جی چاہے انھیں لے جایئے، میں کچھ نہیں کہوں گی۔'

'یہ سب انھی کا تو کیا ہوا ہے۔ سمجھتی ہیں، پرنس آف ویلز ان کا انتظار کر رہا ہے اور میں جو اتنے دن سے ان کا خرچہ اٹھا رہا ہوں، ان کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں، سامان ڈھونے کا خچر ہوں۔ ان کو اس وقت اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔'

''ایک بار سلائیڈنگ بولٹ ہاتھ سے چھوٹنے پر ممتاز میرے برابر میں آ کر گری۔ اس کا

☆۔ یقین مانو میں شراب نہیں پیتی ہوں۔

☆☆۔ میری کتیو، میری خوب صورت کتیو، آج میں تمھیں دکھاؤں گا کیسانووا حقیقی زندگی میں کیسا تھا۔

ہاتھ خونم خون تھا۔ میں بیڈ پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ ممتاز کو میں نے اپنی پشت کی طرف ڈھکیلا۔ فتح نے میرے گریبان کو پکڑ لیا اور اگلے ہی لمحے مجھے اپنے چہرے پر ہڈیوں کو چٹخانے والی چوٹیں محسوس ہوئیں۔

میں اپنے جسم اور دماغ میں بچی ہوئی آخری قوت اور ہمت سے کام لے کر فتح کو دھکا دے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس دن مجھے پتا چلا جو اپنی عزت اور جان کے لیے لڑ رہا ہو، اس سے زیادہ نہ کسی میں قوت ہوتی ہے نہ ہمت اور میں تو نہ صرف اپنے بلکہ ایک دوسری بے بس عورت کے لیے لڑ رہی تھی۔

میرے پیچھے پیچھے وہ بیٹھنے کے کمرے تک آیا لیکن میں تب تک خود کو اس ٹوٹے ہوئے صوفے کے پائے سے مسلح کر چکی تھی جو کچن جاتے ہوئے مجھے ریفریجریٹر کے مقابل پڑا نظر آیا ہوگا جس کی طرف اس وقت میں نے توجہ نہیں کی تھی اور جس کا پایا نہ جانے کیسے میرے دماغ میں پڑا رہ گیا تھا۔ لکڑی کے اس ٹکڑے کو بغیر دیکھے کہ کہاں اس کی ضرب پڑے گی، میں نے پوری طاقت سے فتح کے جسم پر دے مارا۔ ایک بار، دوسری بار، تیسری بار۔ اگر وہ اس کے سر پر بھی پڑتا تو مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ الٹے ہاتھ سے اس نے سیدھا کندھا پکڑ رکھا تھا لیکن نشے میں شاید اسے زیادہ درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

گھر سے باہر نکلنے سے پہلے میں نے دروازے پر کھڑی ہوئی ممتاز سے کہا، 'مسٹر گومی سم چادر۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ اس حلیے میں گھر کیسے جاؤں گی۔'

وہ بھاگ کر ایک سفید چادر لے آئی جسے اوڑھ کر وہ شاید بازار سودا سلف کے لیے جاتی ہوگی۔ سڑک پر کھلنے والا دروازہ کھول کر میں نے ایک نظر فتح پر ڈالی جو کار سے کچلے جانے والے کتے کی طرح بار بار سر اٹھا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

قالین پر کہیں خون نہیں تھا۔

لکڑی کے ٹکڑے کو بڑے صوفے پر پھینک کر میں نے ممتاز کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت وہ وحشت اور سراسیمگی نہیں تھی، آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں احسان مندی تھی اور ایک نئی امید۔''

کلیرس نے چونک کر کہا، ''کوے بول رہے ہیں، مجھے پتا ہی نہیں چلا کب سو گئی تھی۔ نماز نکل گئی۔''

جیور جیانا بھی جاگ اٹھی اور بولی، ''قضا پڑھ لیجیے گا۔ اس وقت آپ کے حصے کی نماز میں پڑھے لیتی ہوں۔ مجھ سے بھی اب بیٹھا نہیں جا رہا ہے۔''

جیور جیانا کی نیند زندگی کی بہت سی حقیقتوں پر سے ایک دم پردہ اٹھ جانے کی وجہ سے اڑ گئی تھی۔ کلیرس لگتا تھا، عدالت میں اپنا بیان اپنی مرضی کے مطابق دے کر نچنت ہو گئی تھی۔ بیان کے درمیان نہ اسے کسی نے ٹوکا تھا، نہ اسے اس میں کاٹ چھانٹ کرنی پڑی تھی۔ اس کے چہرے سے تمام سلوٹیں مٹ گئی تھیں جو جیور جیانا اس دن سے دیکھ رہی تھی جب اس نے کولج سے آ کر سنجیدگی سے اس سے کہا تھا، ''مما ایک کلاس فیلو مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔''

اس سے پہلے جب بھی کوئی لڑکا اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا تھا، اس کے لیے اپنی سیٹ خالی کر دیتا تھا یا ساتھ چل کر چائے پینے کے لیے کہتا تھا، وہ گھر آ کر ہنستی ہوئی ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہتی تھی، ''مما آئی ہیو این اَدر رومیو اِن لائن فور می۔''☆

اور کلیرس بھی اس بات کو ایک دلچسپ خبر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی لیکن صمد کا ذکر ایک بار آیا، دوبارہ آیا، تی بارہ آیا اور ہر بار سنجیدگی سے۔ جیور جیانا میں اس تبدیلی نے کلیرس کو بے چین کر دیا تھا۔

پھر ایک دن جیور جیانا ایک گروپ فوٹو لے کر گھر آئی اور اسے کھانے کی میز پر ماں کے سامنے رکھ دیا۔ کلیرس نے ایک نظر دلچسپی سے تصویر پر ڈالی، اس میں کوئی ایسی چیز تھی جس سے ڈر کر اس نے چہرہ پرے کر لیا۔ جیور جیانا بتا رہی تھی، ''مما یہ صمد کی فیملی ہے، یہ اس کی مدر ہیں، یہ فادر، یہ بہن، یہ چھوٹا بھائی اور یہ وہ خود۔''

لیکن کلیرس نے دوبارہ سر اٹھا کر تصویر کی طرف نہیں دیکھا حالانکہ جیور جیانا نے کہا بھی تھا، ''صمد نے اصرار سے کہا تھا، 'یہ تصویر آنٹی کو دکھانا'۔''

☆۔ مجھ سے محبت کرنے والوں کی قطار میں ایک اور کا اضافہ ہوا ہے۔

پھر ایک دن جیور جیانا نے پڑھائی کے دوران کلیرس سے پوچھا، ''مما میں مسلمان پیدا ہوئی تھی اور مسلمان ہوں۔ آپ کا نام میری سمجھ میں آتا ہے، ڈیئر ڈیفنی آف بلیسڈ میموری☆ نے کلیرس اس وقت رکھا ہوگا جب آپ پیدا ہوئی تھیں یا ہوسکتا ہے میری نانی، کوئن میری اُوف ایکولی بلیسڈ میموری☆☆ نے، لیکن میرا نام جیور جیانا کیوں رکھا گیا تھا اور کب؟''

''تمھارے وجود میں آنے سے پہلے۔ میری کی خواہش تھی نواسا ہوا تو اس کا نام جورج رکھوں گی اور نواسی ہوئی تو جیور جیانا۔ انھیں برٹش شاہی خاندان سے عشق تھا اور وہ دور شاید کنگ جورج سکستھ☆☆☆ کا ہوگا۔''

پھر جیسے جیور جیانا نے خود سے بولنا شروع کیا، ''میں نے ایک دن صمد کو بتایا تھا، اگر تم میرے گھر آؤ اور مما کو کسی جیور جیانا کو اس نام سے مخاطب کرتے سنو تو حیران ہوکر اِدھر اُدھر مت دیکھنے لگنا کہ یہاں یہ تیسری عورت زاد کون ہے؟ وہ میں ہوں جسے تم صومیہ کے نام سے جانتے ہو۔ لیکن میں نے اسے منع کر دیا ہے، خبردار کسی کو میرا یہ نام پتا نہ چلے ورنہ سارے کولج میں اڑ جائے گا۔ اب وہ بھی مجھے کبھی کبھی جیور جیانا کہتا ہے۔''

''اکیلے میں؟''

نڈر ہوکر جیور جیانا نے کہا، ''جی۔''

''تم اس سے کتنی نزدیک ہوچکی ہو؟'' کلیرس نے ہمت باندھ کر کہا۔

''بالکل بھی نہیں۔''

''آئی بیلیو یو۔''☆☆☆☆ کلیرس نے کہا جو بہ یک وقت سوال بھی تھا اور بیٹی پر اعتماد کا اظہار بھی۔

''صرف ہاتھ ملانے تک۔'' جیور جیانا نے کہا۔

کلیرس نے ہاں میں سر ہلایا جس کا مطلب جیور جیانا نہیں سمجھ سکی۔

آنے والے دنوں میں جیور جیانا کلیرس کو خاموش خاموش لگی۔ 'ہوسکتا ہے امتحان سر پر

☆۔ Dear Daphne of blessed memory　☆☆۔ Queen Mary of equally blessed memory

☆☆☆۔ شہنشاہ جورج ششم　☆☆☆☆۔ مجھے تمھاری بات کا یقین ہے۔

ہیں ان کے بارے میں فکرمند ہو یا یہ کہ زندگی میں آنے والی اس بڑی بے چینی کی وجہ سے ٹھیک طرح پڑھ نہ پاتی ہو۔ اس آخری خیال کو کلیرس نے جھٹک دیا۔'وہ جو بھی کرے گی مجھ سے چھپا کر نہیں کرے گی اور جو کچھ بھی اس کے من میں ہوگا وہ مجھے بتائے گی۔'

پھر ایک رات جب کلیرس سوتی جا رہی تھی اور سمجھی تھی جیور جیانا بھی سو چکی ہے، بے چاند کی رات تھی، کمرے کے اندھیرے میں اسے آواز آئی، ''مما وہ لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

کلیرس خاموش رہی۔

جیور جیانا نے کہا، ''مما آپ سو رہی ہیں؟ صمد کے امی، ابا اور دادی آپ سے ملنے آنا چاہتے ہیں۔'' اس کے بعد چند سانسوں کے وقفے سے جیور جیانا نے پھر کہا، ''آپ سو رہی ہیں؟''

''نہیں۔''

''اس کے بہن بھائی بھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

پھر بہت سی خاموش سانسیں دونوں طرف لی گئیں۔ بالآخر کلیرس نے کہا، ''صبح بات کرنا'' اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔

جیور جیانا کو اپنی ماں پر بالکل غصہ نہیں تھا۔ اسے ان کے دکھ یاد تھے، جب وہ بالکل بچی تھی۔ پھر جب وہ اسے گروسری خریدنے کے لیے اپنے ساتھ سڑک پر لے جاتی تھیں اور ایک جگہ اسے لگتا تھا، یہاں کوئی میوزک اور ڈانسنگ اسکول ہے اور وہ اس امید میں کہ اگر سڑک کی دوسری طرف سے جا کر دیکھا جائے تو اسے وہاں لڑکیاں ناچتی نظر آئیں گی اور ہول میں ایک طرف کوئی آدمی پیانو فورٹ پر بیٹھا نظر آئے گا، وہ اس کے نوٹس (notes) پر ایک بار کو پکڑے ایک ساتھ ایک طرف کی ٹانگیں اٹھائیں گی جیسے ایک پر اٹھائے بطخوں کی ایک لائن ہو، کلیرس سے کہتی تھی، ''مما سڑک پر اُس طرف چلیے، اِدھر کیا رکھا ہے۔ ہر بار آپ اسی طرف چلتی ہیں۔''

اس کی بات سن کر کلیرس ہنس پڑتی اور ہاتھ پکڑے اسے سڑک کے اُس پار لے جاتی۔

اس دور میں ایک شخص تھا حمزہ، جسے وہ پپا کہتی تھی اور جس نے اس کی ماں کو بہت دکھ دیے تھے۔ ایک وقت آیا تھا جب کھانے کی میز سے سب اچھی چیزیں اٹھ گئی تھیں اور آخری بار اسے یاد تھا وہ کسی عورت کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور رات اس نے شراب پی کر مما پر ظلم کیے

تھے۔ مما نے بہت ظلم سہے تھے اور جب اس بے غیرت پپا کے انھیں چھوڑ جانے کے بعد ان کے پرانے ہم مذہب انھیں واپس اپنوں میں لوٹ آنے کی دعوت دے رہے تھے تو بھی وہ مذہب تبدیل کرنے پر راضی نہیں ہوئی تھیں کیوں کہ حقیقت میں تو انسان کا مذہب وہ ہوتا ہے جو وہ سمجھ آنے پر خود اختیار کرتا ہے، وہ نہیں جو اسے آنکھیں کھولنے پر ملتا ہے اور ساری زندگی وہ اسے یہی سمجھ کر سینے سے لگائے رکھتا ہے کہ یہی میرا مذہب ہے اور اگر روح میں تھوڑا سا شک پیدا ہو تو priests (پادریوں) کی طرف لپکتا ہے کہ میرے اعتقاد کی دیوار گرنے کو ہے، اسے سہارا دو اور وہ بھی اسے اڑواڑ (buttress) لگانے کو آجاتے ہیں بلکہ پریسٹس اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آنے دیتے۔ ہر وقت اپنے پیچھے چلنے والوں کے اعتقاد کی پشتہ بانی کرتے رہتے ہیں کہ غلط خیال ان کے دماغ میں نہ سمائیں۔

ہم مشکل میں تھے، مما کے لیے مجھے اسکول بھیجنا بھی دشوار تھا لیکن نہ وہ اپنے رشتے داروں کے کہنے سے اپنی بچی کے لیے صبح کو دودھ، کورن فلیکس اور اچھے اسکول کی خاطر اپنے ماں باپ کے مذہب میں واپس چلی گئیں، نہ چرچ سے آنے والے کارکنوں کی ایما پر جو انھیں بڑھاپے اور موت سے ڈرانے آئے تھے۔ ان لوگوں کے لیے اسے اپنا غصہ یاد تھا۔

اس کے بعد اسے ایک چھوٹے فلیٹ میں ماں کے ساتھ اٹھ جانا یاد تھا اور ایک ڈاکٹر فتح جو خود کو ہولی وُڈ ایکٹر سمجھتا تھا اور جو اسے پہلے ہی دن سے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

اسے وہ رات بھی یاد تھی جب سڑک سنسان ہو چکی تھی اور وہ کھڑکی میں کھڑی ماں کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر اسے لگا تھا جیسے ایک روح چلی آ رہی ہے، بالکل پاک صاف، اس کا لباس فرشتوں کے پروں کی طرح سفید تھا اور وہ روح آکر بلڈنگ کے اسٹیئر کیس میں داخل ہوگئی۔ وہ بالکل نہیں ڈری تھی اور ڈرتی بھی تو بھاگ کر کس کے پاس جاتی۔ پھر اس نے آہستہ سے لیا ہوا اپنا نام اپنی ماں کے منھ سے دروازے کے دوسری طرف سے سنا اور دروازہ کھول دیا۔ اس رات بھی مما خوف زدہ نہیں تھیں جیسے وہ پیدا ہی میری حفاظت کے لیے ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر جگہ جگہ نیل تھے اور چادر کے نیچے سے جو جسم نکلا اس کے کپڑے تار تار تھے۔

جیور جیانا نے ایک بار سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ وہ شاید سو رہی تھیں۔ بجائے غصہ آنے

کہ اسے ماں پر پیار آ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی، انھوں نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے تھے اور اسے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ وہ دکھ کس قسم کے تھے، کس نے دیے تھے۔

فتح کے ساتھ اس رات جا کر کلیرس نے گھر سے نکلنا چند دن بند رکھا اور جیور جیانا کو بھی کھڑکی پر سے باہر دیکھنے کو منع کر دیا تھا۔ ایک میں انھیں تیزاب پھینکے جانے کا خطرہ تھا، دوسرے میں گولی کا۔

اس کے بعد چند دن تو ٹیلی فون کولز آئیں جن کے لیے نہ وہ اٹھتی تھیں، نہ جیور جیانا کو اجازت تھی کہ جا کر ہیلو تک کرے۔ پھر ٹیلی فون کٹ گیا اور بل آنے شروع ہو گئے اور مما ڈرتی تھیں۔ ایک دن بجلی، پانی اور گیس سے بھی ہم محروم کر دیے جائیں گے۔

ان ہی دنوں وہ لڑکا جس کا نام مجی تھا ایک دن نیچے کے فلیٹ سے بتانے آیا تھا، آنٹی آپ کا فون ہے اور انھوں نے چونکی ہو کر پوچھا تھا، وہاں میرا فون کیسے آیا اور تمھیں کیسے پتا چلا کہ فون میرے لیے تھا؟

مجی ہنس پڑا تھا اور بولا، ''پہلے آپ چل کر کول ریسیو کر لیجیے ورنہ کٹ جائے گی۔''

وہاں سے جب وہ لوٹیں تو لگتا تھا رو کر آئی ہیں۔ میں نے پوچھا تھا، ''کس کا تھا۔'' انھوں نے کہا تھا، ''اس کا جسے تم پہلے ہی دن سمجھ گئی تھیں سانپ ہے اور جسے میں اتنے دن پہچان نہیں پائی یہاں تک کہ اس نے مجھے کاٹ لیا۔''

گھر میں کوئی گروسری اسٹور تو تھا نہیں کہ اس کے سہارے ہم مہینے دو مہینے جی لیتے۔ آخر کار انھوں نے اندھیرا ہونے پر نیچے جانا شروع کیا۔ تیزی سے جاتی تھیں اور چند ہی منٹ بعد کچھ نہ کچھ لیے لوٹ آتی تھیں۔ وہ کچھ نہ کچھ لوف اوف بریڈ☆ بھی ہو سکتی تھی، چند گاجریں بھی اور دودھ کا پیک۔ اسے وہ مذاق میں لینٹ کا افطار کہتی تھیں اور جسے میں نہیں سمجھتی تھی کہ کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی ماں کو لینٹ کے چالیس دن کے روزے رکھتے دیکھا تھا اور افطار کی برائے نام مقدار کو دیکھ کر روزے رکھنے سے بھاگ لی تھیں۔ لیکن ہم ماں بیٹی اس سے بھی گئی گزری غذا پر زندہ تھے۔ ان دنوں مجھے اکثر احساس ہوتا تھا ہمارا دنیا میں کوئی بھی تو نہیں ہے۔ نہ مما کے بہن

☆۔ ڈبل روٹی

بھائی، نہ میرے۔ ان کے پاس جو پیسے تھے انھیں وہ بہت ہاتھ روک کر خرچ کر رہی تھیں۔

ایک دن انھوں نے میرے جسم کو دیر تک ٹٹولا، بازوؤں کو، پسلیوں کو، کھوؤں کو اور جیسے خود سے بولیں، ' اس طرح کام نہیں چل سکتا، میں کل صبح سے پنشن کے لیے خود بھاگ دوڑ کروں گی۔ اگر کوئی ٹیوشن مل گئی تو وہ بھی کرلوں گی۔ اگر فتح مجھے بدشکل بنانے پر تلا ہوا ہے تو وہ بھی کر لے۔ لیکن میں اب گھر میں نہیں بیٹھوں گی۔'

اور واقعی وہ باہر جانے لگیں۔

ایک دن جب وہ تھکی ہاری گھر آئیں تو میں نے پوچھا، کام ہوگیا؟ حالانکہ میں کام کی نوعیت نہیں سمجھتی تھی۔ 'شروع ہی کب ہوا تھا جو ہوجاتا' انھوں نے تلخی سے کہا۔

انھی دنوں انھوں نے ایک بار پھر گھر کا سامان بیچنا شروع کیا تھا۔ لوگ آتے تھے، چیزوں کو اِدھر اُدھر کرکے دیکھتے تھے اور اگر وہ دو سو کہتی تھیں تو وہ سو کہہ کر چلنے کو ہوجاتے تھے۔ اس پر وہ لجاجت برتتی تھیں۔ وہ قالین یا وہ جو کچھ بھی ہوتا اٹھا کر انھیں روپے تھماتے تھے اور چلتے بنتے تھے اور ہر دفعہ اس چیز کے چلے جانے کے بعد میں دیر تک کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ اس طرح کیا ہم دونوں اس گھر میں ایک دن اکیلے رہ جائیں گے... نہ میز ہوگی، نہ کرسی، نہ لیٹنے کے لیے بیڈ۔ پھر ہم ان دو خالی کمروں میں رات بھر کیا کیا کریں گے، لیکن میں روتی نہیں تھی۔

مما کو پنشن کی امید بندھتی جا رہی تھی۔

پھر وہ رکشا والا جو انھیں کچھ دن سے لانے لے جانے لگا تھا اور ہمارا ہم درد تھا، ان کا دشمن بن گیا۔

۸

کئی دن ماں بیٹی میں نہ پرانے واقعات کا ذکر آیا نہ جیور جیانا نے صمد سے شادی کرنے کی اجازت مانگی۔ جیور جیانا کو صدمہ تھا، کیوں اس نے ماں کو ان پرانی باتوں کو دُہرانے سے روک نہیں دیا تھا۔ اس رات کے بعد سے جب دونوں خالہ کے گھر کے میلاد شریف سے لوٹی تھیں اور زندگی میں پہلی بار وہ اسے اپنی داستانِ غم بے کم و کاست سناتی رہی تھیں، وہ ایک دم

خاموش ہوگئی تھیں اور یہ اس لیے ہوا تھا کہ جیورجیانا مصر تھی کہ وہ اس کی پسند کے لڑکے کو دیکھنے کو رضامند ہو جائیں۔

اسے معلوم تھا ماں نے بہت ہی بُری زندگی گزاری تھی لیکن اس کی تفصیل پہلی بار کلیرس نے اسے سنائی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ پہلے وہ بچی تھی اور اب ایک لڑکے سے عشق ہوجانے کے بعد وہ ان کی ہم راز بننے کے لائق ہوگئی تھی۔

مگر کیا میں ان باتوں کو سننا چاہتی تھی؟ اپنے لیے وہ کہتی ہیں، تم اتنا مجھ پر احسان کرنا اپنے بارے میں سب کچھ مجھے کبھی نہیں بتانا۔ اب تمھاری زندگی میں جو آئے گا، خدا نہ کرے، وہ ہوگا تکلیف سے بھرا۔ اسے میرے کانوں میں مت ڈالنا۔

اِدھر اُدھر چلتے پھرتے وہ ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی تھی۔ وہ اسے لپٹا کر پیار کرلیتی تھیں۔ لیکن اس سے زیادہ نہیں۔

کلیرس کو اکثر خیال آیا، جیورجیانا سے کہے تم خود فیصلہ کرلو۔ پھر وہ سوچتی تھی کیا یہ میرا فیصلہ درست ہوگا؟ جب وہ اس شہر میں آئی تھی سات سال کی تھی، اب سترہ کی ہے۔ کیا واقعی میری جیورجی اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ اپنی زندگی کا سب سے مشکل فیصلہ خود کرلے۔ اسے جیورجیانا خاموش نظر آتی تھی۔ وہ صبح اُٹھ کر ماں کے بستر پر آکر اپنی آخری نیند پوری نہیں کرتی تھی۔ ماں سے چپٹ کر جو چند خراٹے وہ لے لیتی تھی وہ شاید رات بھر کی نیند سے زیادہ سکھ دینے والے ہوتے تھے۔ اسے افسوس تھا، اس نے ہی اپنی رات بھر کی تلخ باتوں سے اس کے ذہن کے بچپن کو بھگا کر وہاں ایک بوڑھی آتما جگا دی تھی۔

ایک دن جیورجیانا نے بے وقت کوفی بنائی اور سینڈوچ اور ماں کے پہلو میں بیٹھ کر اس نے ایک سینڈوچ ان کے بند منھ میں تقریباً ٹھونسا اور بولی، ''مما اس دن کی بات تو ادھوری ہی رہ گئی۔''

''کون سی؟''

''وہاں سے یہاں آنے کی۔ بس اتنا ہی تو نہیں ہوا تھا کہ ممتاز کے ہاتھ میں ٹوٹے ہوئے صوفے کا پایہ دے کر کہ لو اب تم اس سے اپنی حفاظت کرو، مجھے لے کر آپ اس شہر میں آگئی تھیں کہ یہ امن و عافیت کا شہر ہے۔ آپ اس موت کے کنویں سے نکلی کیسے تھیں؟''

کلیرس عرصہ بعد ہنس پڑی۔ بولی ''ممتاز کے ہاتھ میں دے کرنہیں، صوفے پر پھینک کر۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا، سب تمھیں یاد ہے۔''

''نہیں مما نہیں، میں جو دیکھ رہی تھی وہ مجھے یاد ہے۔ اندر کیا ہو رہا تھا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ان دنوں کے بارے میں ہم میں بات ہی کب ہوئی ہے۔''

''زخمی ہوجانے کے کئی دن بعد فتح کا فون آیا تھا۔ پہلا اور آخری، ایک ہارا ہوا غنڈہ جس کی بے عزتی اس کی بے بس بیوی کے سامنے ہوئی تھی، کیا کہہ سکتا تھا؟ یہی کہ 'تمھارا فون کٹوا دوں گا، تمھاری پنشن رکوادوں گا، تم جس عصمت کی دہائی دیتی ہو اسے تم سے دکان میں بکوا دوں گا۔ تم دونوں کو تباہ کردوں گا، تمھاری لڑکی کو ایسا کردوں گا کہ وہ کسی کے سامنے زندگی بھر نہ آسکے' پھر اسے لگا ہوگا دیوار سے بات کر رہا ہے اور مجھے ریسیور کے پٹخنے کی آواز آئی۔

میں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

پھر میں نے پنشن کے لیے دوڑ دھوپ شروع کی۔ میرا خیال ہے، وہ رکشا والا رجب اسی کا آدمی تھا۔ اسی نے اسے میرے پیچھے لگایا تھا اور جسے میں نے بہت جلد جھٹک دیا۔ وہ میرے اندر بڑی تبدیلی تھی اور ابھی تک قائم ہے۔

فون کبھی کٹ جاتا تھا کبھی بغیر رپورٹ لکھائے تھوڑی دیر کے لیے ٹھیک ہوجاتا تھا جس میں ایک اہم آدمی سے ملنے کا حکم دیا جاتا تھا کہ وہ یہ کام کرا دے گا، بینک کا پیسہ بھی مل جائے گا، پنشن اور گریجوئٹی بھی، اس سے جا کر ملو۔

لیکن میں جواب دینا تو کجا اتنی دیر سانس تک نہیں لیتی تھی۔

پھر فون مکمل طور سے مردہ ہوگیا۔ وہ، وہ دور تھا جب بلوں کی ادائیگی نہ کرنے پر مجھے دھمکیاں ملتی تھیں، ایک ایک کرکے بجلی، گیس، پانی سب چلے گئے۔

تمھیں وہ دن یاد ہے جب بجلی نہ ہونے کی وجہ سے دروازے کی گھنٹی ڈیڈ تھی اور لوگ دروازہ پیٹ رہے تھے؟''

''اور ایک عورت کی آواز آئی تھی، 'دروازہ کھولو میں تمھاری رشتے دار ہوں۔''

''ہاں۔'' جیورجیانا نے کہا۔ ''لیکن اس اَن جان عورت کے لیے آپ نے دروازہ کھول

کیوں دیا تھا۔ اس کے آنے سے تو آپ کو اور بھی تکلیف ہوئی تھی۔"

کلیرس مسکرائی اور جیسے ہوا میں لکھا پڑھنے لگی:

"Be not forgetful to entertain strangers. For thereby some have entertained angels unawares."☆

جیور جیانا نے کھلکھلا کر کہا، "تو وہ اجنبی آپ کے لیے فرشتہ نکلیں اور آپ نے ان کی خاطر تواضع کی۔"

"وہ مجھ سے زیادہ غم زدہ تھی اور گھر میں تھا کیا کہ اس کی خاطر تواضع کرتی۔ میں اسے پنکھا جھلتی رہی اور وہ مجھے ایک بلا معاوضے کا مشورہ دے کر چلی گئی کہ وہ شہر میں جلد از جلد چھوڑ جاؤں۔ تمھاری اور میری عافیت اسی میں تھی۔ میں نے اس سے فتح پر اپنے حملے کا ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی میرا خیال ہے، اس عرصے میں وہ دونوں ملے تھے ورنہ اس بات کا ذکر وہ ضرور لاتی۔ شاید وہ یہ دیکھنے آئی تھی کہ فتح ہمارے یہاں تو نہیں رہنے لگا ہے۔

"مار کھانے کے بعد ہمارے فلیٹ میں فتح کا فون آیا تھا۔ فاطمہ آپا کے گھر ایک موٹی آواز والے آدمی کا فون آیا تھا، 'تم ان صاحب سے ملیں کیوں نہیں؟' اس کی آواز میں دھمکی تھی، لیکن وہ آواز رجب کی نہیں تھی۔

جب میں ریسیور رکھ کر پیچھے ہٹی تو آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ فاطمہ آپا نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور دیر تک میرے زخم کی تھاہ کو ڈھونڈتی رہیں۔ ان کی ایک ٹانگ پلاسٹر میں تھی۔ دیر تک میں ان کے پاس بیٹھی رہی۔ مما اور مجھ میں روحانی قرب نہیں تھا۔ فاطمہ آپا کی پہلی ہستی تھی جس سے میں نے خود کو نزدیک ہوتے محسوس کیا۔

جب میں ان کے پاس سے اٹھی تو انھوں نے کہا، 'میرے لیے سیڑھیاں چڑھنا اترنا دشوار ہے تم جب جی چاہے چکر لگا جایا کرو۔'

ہم بخوشی ان کے گھر جانے لگے۔ اور کرنے کے لیے کیا تھا۔ میں انھیں فاطمہ آپا کہنے لگی، تم خالہ، تم بہت جلدی سے گھل مل گئیں، وہ اکثر اوپر آتا تھا اور تمھارے لیے کچھ نہ کچھ لے

☆۔ اَن جانوں کی خاطر تواضع سے بے توجہی مت برتو، کیوں کہ اسی طرح بعضوں نے فرشتوں کی ضیافت بغیر جانے ہوئے کی ہے۔ (Hebrew 13:12) (عبرانیوں ۱۳:۲)

کر آتا تھا۔ شاید وہ جان گیا تھا تم ان چیزوں کے لیے ترسی ہوئی تھیں۔ میری ہاں کا اشارہ پا کر تم وہ چیز لے لیتی تھیں۔ فاطمہ آپا تمھیں آئس کریم منگا کر دیتی تھیں۔ میرا خیال ہے ان کے دل میں میری بڑی عزت تھی، جو غلط تھی۔"

ٹوکنے کے لیے جیور جیانا نے مصنوعی کھانسی کی آواز نکالی۔ کلیرس اس کھانسی پر رُکی نہیں۔ بولی، "میں جانتی ہوں، میں کیا ہوں۔ میں نے انھیں اپنا پورا حال سنا دیا تھا۔ تقریباً مسلمان ہونے سے اس فلیٹ میں آنے تک۔ لیکن فتح والی بات مجھے بدلنی پڑی تھی کہ وہ صحیح آدمی نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے دھوکے سے شادی کی تھی اور چاہتا تھا، میں اس کے مرد دوستوں سے ملوں اور وہ چاہے گھر پر نہ ہو، ان میں سے جو بھی آئے اس کی مدارات کروں۔ اس پر فاطمہ آپا نے استغفراللہ کہا تھا اور میں نے کہا تھا، جی ہاں جس قسم کی زندگی سے مجھے نفرت تھی، اس کے خیال میں اسے میں آسانی سے اپنا سکتی تھی۔ اور جب میں اس پر راضی نہیں ہوئی تو اس نے اپنی پہلی بیوی کے گھر لے جا کر مجھے مارا۔ فاطمہ آپا نے کہا، 'آدمی تھا یا شیطان۔' میں نے کہا اس کے بعد اس نے مجھے طلاق دے دی۔

فاطمہ آپا کی لڑکی اور شوہر عمرہ کرنے گئے ہوئے تھے اور جس دن فلائٹ تھی اس سے دو دن پہلے وہ فلیٹ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے گری تھیں اور ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ مگر اس وجہ سے انھوں نے نہ شوہر کو اپنا پروگرام بدلنے دیا نہ کشور کو۔

محی میرے بہت سے کام کر دیتا تھا۔ اسے لے کر میں ایک بار پھر بازار جانے لگی تھی۔ وہ آفس اور عدالت کے چکر بھی میرے ساتھ لگاتا تھا۔ جتنی دیر میں باہر رہتی تھی..."

"میں خالہ کے پاس رہتی تھی۔" جیور جیانا نے کہا۔

"فون پر وہ اپنے شوہر کو میرے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھیں کہ ایک مسلمان عورت ہے جو عیسائی سے مسلمان ہوئی ہے اور دو مسلمان مردوں نے اسے شوہر بن کر دھوکا دیا۔ وہ ابھی تک مسلمان ہے لیکن وہ دونوں شہدے نکلے۔ پہلا کہیں مرا ہوا ملا تھا اسے چھوڑ چکا تھا، دوسرے نے نکاح کے کاغذ وغیرہ پھاڑ دیے تھے اسے غلط راہ پر نہ لگا سکنے کی وجہ سے اس نے طلاق دے دی۔ یہ بات میری موجودگی میں ہوئی تھی۔ پھر انھوں نے ریسیور کے بالکل پاس منھ لے جا کر

کچھ کہا تھا جو میرا خیال ہے ان کے میرے بارے میں خطرے کو ظاہر کرتا ہوگا کہ 'اگر ہم نے اس بے سہارا عورت کو یوں ہی چھوڑ دیا تو وہ خود تو نہیں کیوں کہ پابندی سے نماز پڑھتی ہے اور انگریزی میں قرآن شریف، کہیں اس کی بیٹی غلط لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔'

'فاطمہ آپا کی ساس سے میں ملی نہیں، صرف تصویر دیکھی ہے... ایک دُبلی سی سن رسیدہ عورت جس کے ماتھے پر سجدے کا نشان تھا، زندگی کے آخری دن گزارنے کے لیے کئی سال سے وہ مدینے میں رہ رہی تھیں۔ وہ کہہ کر گئی تھیں ان کی ہڈیوں کو وہیں کی خاک بننا تھا کیوں کہ انھوں نے جانے سے پہلے طے کرلیا تھا وہ مریں گی تو وہیں، نہیں تو نہیں، خواہ ہزار برس ان بڈھی ہڈیوں کے ساتھ جینا پڑے۔

فاطمہ آپا نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ تمھارا دوسرے شہر میں انتظام کرادیں گی، خود نہیں آئیں گی، آپا خود ان سے ایک سال پہلے مدینے میں ملی تھیں۔ اس سال ملنے نہیں جاسکیں جس سال اس بوسیدہ کھال اور بوڑھے جسم کو جنت البقیع کی خاک میں پہنچنا تھا۔''

کلیرس نے آنسوؤں کو بہنے دیا۔

''بے چاری بیوہ تھیں۔ ان کے شوہر بھی دین دار، خدا ترس آدمی تھے اور وہ خود بھی۔ لوگ ان کے معتقد تھے، رشتے دار اور واقف دونوں۔ جب وہ یہاں تھیں بیماروں، ناداروں کے کام آتی تھیں۔

جب کوئی عورت مرتی تھی ، بن بلائے اسے غسل دینے پہنچ جاتی تھیں۔ آپا نے بتایا تھا، پہلی بار میرا حال سن کر وہ فون ہی پر رو پڑی تھیں۔''

جیور جیانا نے کہا،'' ان کی تصویر میرے ذہن میں ہے جیسے ہوا میں اڑتی ہوئی آک کی بڑھیا، ویسے ہی سفید بال، بغیر جسم کی، کب تک زندہ رہیں؟''

''جب ہی مرگئی تھیں، بہت بوڑھی تھیں، میں نے صرف ایک بار ان کی آواز فون پر سنی تھی۔ پوچھ رہی تھیں، 'اپنے نئے گھر میں پہنچ گئی ہو؟' میں نے کہا 'جی۔' بولیں، 'خوش ہو؟' میں نے کہا، 'جی... آپ کی بدولت۔' بولیں، 'خدا کے ساتھ کسی اور کو مت ملاؤ۔ کہو خدا کی بدولت۔' میں نے شرمندگی کے ساتھ کہا، جی خدا کے کرم سے۔ بولیں، 'خدا تمھیں اور صومیہ کو خوش رکھے۔'

وہاں مدینے میں چند اور بوڑھی عورتوں کے ساتھ ایک کھنڈر جیسے مکان میں رہ رہی تھیں۔ اپنا کھانا خود پکاتی تھیں، اپنے کپڑے خود دھوتی تھیں۔ اب وہ مکان بھی مٹ چکا ہوگا۔''

اس کے بعد جو خاموشی رہی، وہ اس بات کی علامت تھی کہ کلیرس سے آگے نہیں بولا جا رہا ہے۔ پھر اس نے گلا صاف کر کے کہا، ''ہم جو آج یہاں سکون سے بیٹھے ہیں، سب ان کی خدا ترسی کی بدولت ہے۔ وہ اپنی اکیلی ذات میں وہ تھیں جو پوری مشن سوسائٹیز ہوتی ہیں، بغیر مشن سوسائٹیز کو ملنے والی امداد کے۔ ان کی بات ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔

آپا کے شوہر نے عمرے سے آ کر میرے وہ تمام کام چند دن میں کر دیے جن کا وعدہ فتح مہینوں سے کر رہا تھا۔ فتح سے دوسری شادی کا ذکر ایک بار بھی نہیں آیا۔

اتنے دن کرایہ نہ دے سکنے کی وجہ سے ہم فاطمہ آپا کے ساتھ رہے۔ لیکن اَن جانے مردوں کی دھمکیاں اور خط جاری رہے۔ فون کے پاس میں جاتی نہیں تھی اور خط بغیر پڑھے پھاڑ دیتی تھی۔

مجھے جن چند موقعوں پر عدالت یا ریلوے کے دفتر جانا پڑا میں برقع پہن کر گئی، ساتھ کشور اور بھائی صاحب ہوتے تھے۔ دفتر والے مجھے دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ ایک تو وہی تھا جس نے پہلے کبھی کہا تھا، 'یہ اپنے حمزہ بھائی کی بیوی ہیں'۔ دوسرے نے کہا تھا، 'آپ کا کام تو جب ہی ہو جاتا لیکن آپ نے آنا بند کر دیا'۔ اب میں ان بے لوث محبت کرنے والوں سے کیا کہتی کہ 'سب آپ جیسے نہیں ہیں۔ کچھ ہم دردوں نے میرا گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا اور اگر پھر بھی نکلتی تو یہ چہرہ آج آپ نہیں پہچانتے'۔

کشور اور بھائی صاحب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی مجھے ہر جگہ لگتا تھا، مجھ سے کچھ فاصلے پر فتح میرے ساتھ چل رہا ہے یا اس کے آدمی لیکن گیدڑ کی طرح ان میں میرے پاس آنے کی ہمت نہیں تھی۔

گورنمنٹ کا کام ختم ہو جانے پر ایک شب ہم اس بڑے شہر سے اس ادنیٰ سے شہر میں بھاگ آئے لیکن اس طرح کہ کپڑوں کا صندوق تک وہیں چھوڑنا پڑا۔ میں برقعے میں تھی، تم چادر لپیٹے، شمیمہ کے باپ یہاں لے کر آئے تھے۔ مرحومہ ان کی ساس تھیں لیکن حقیقت میں ان کا رشتہ اپنی ساس سے ایسا تھا کہ اگر وہ کہہ دیتیں نوکری چھوڑ کر اور گھر بیچ کر مدینے آ جاؤ تو خالہ خالو

چل پڑتے خواہ وہاں کی حکومت انھیں گھسنے نہ دیتی۔ وہ لوگ اس طرح ہماری مدد کر رہے تھے جیسے قرض میں پھنسے ہوئے کی گردن چھڑا رہے ہوں یا لونڈی غلام کو ظلم سے آزاد کرا رہے ہوں۔

'ایک نئی سوسائٹی کو اپنانا اس صورت میں کہ کسی کی اپنی سوسائٹی نے اُسے ٹھکرا دیا ہو، بڑا تکلیف دہ تجربہ ہے جو سالوں جاری رہتا ہے۔ پچھلے اچھے برے لوگ، پچھلی جگہیں، واقعات خواب میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں اور میں تو اس شہر میں بچپن سے رہ رہی تھی، جسے چھوڑ آئی تھی بلکہ جسے مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔ تم بچی تھیں، آ کر آسانی سے اسکول کی بغیہ میں لگ گئیں۔ میں غموں کے بوجھ سے جھک جاتی لیکن شمیمہ کے والد نے مجھے ٹیوشن دلوا دیے۔ کبھی کسی اسکول میں پڑھایا، کبھی بچوں کے گروپ کو گھر میں بلا کر۔ لگتا ہے ان مدینے میں رہ بسنے والی پاک روح سے لے کر مجی اور شمیمہ تک ان لوگوں کے سپرد قدرت نے یہی ایک کام کیا تھا، میری توبہ، اسی قسم کے اَن گنت کام سپرد کیے ہوں گے جنھیں کرنے کے لیے دوسروں کے پاس وقت نہیں ہوتا ہے۔

میں تو وہاں سے یہاں اس طرح آ گئی تھی جیسے ایک خوش قسمت لڑکی محبت کرنے والے ماں باپ کے گھر سے نکل کر محبت کرنے والے ساس سسر کے گھر آ جاتی ہے۔ میں بھی ایک گھر سے دوسرے گھر میں آ گئی۔ لیکن برقعہ پہن کر، جس کی ضرورت حقیقت میں ہوس ناک نظروں والے مردوں کو ہوتی ہے، عورت کو نہیں۔ بہت کم عورتیں وہ ہوس ناک نظر رکھتی ہیں۔''

''اگر رکھیں تو مردوں کو برقعہ پہننا پڑے۔'' جیور جیانا نے شرارت سے کہا۔

''ایک آخری بات، مرد عورت کا شوہر ہو یا امیدوار دونوں صورتوں میں...''

"He is equally unpredictable"☆ جیور جیانا نے کہا۔

کلیرس ہنس پڑی اور لمحے بھر بعد بولی، ''اب تم بتاؤ کیا چاہتی ہو؟ تم میں ہے ہمت کسی کی بیوی بننے کی؟ میرج اور ارینجڈ میرج☆☆ میں بس چہرہ دیکھے ہونے اور آواز پہچاننے کا فرق ہے۔''

اب جیور جیانا رو رہی تھی۔ بولی، ''میری دکھیاری ماں، آپ نے زندگی میں کتنی تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔''

☆۔ اس کے بارے میں کہا نہیں جا سکتا ہے، اگلے لمحے میں کیا کرے گا۔ ☆☆۔arranged marriage

لیکن کلیرس کا دماغ جیسے کہیں اور تھا۔ اس کی بات جیور جیانا کی ہم دردی سے رکی نہیں، جاری رہی۔ چند سانسوں کے بعد اس نے کہا، ''اصل میں شادی ہنی مون کے بعد شروع ہوتی ہے جب دونوں کی شخصیت کے پیاز کے سے چھلکے اترنے شروع ہوجاتے ہیں۔ شادی سمندر ہے، کہیں گہرا کہیں سطح کے فوراً ہی نیچے چٹانیں چھپی ہوتی ہیں۔ میں نے زندگی کے سورج کی تیز کرنوں سے عافیت کے لیے اس میں دوبار غوطہ لگایا اور دونوں ہی بار زخمی ہوکر سطح پر ابھری۔ دوسری بار کے بعد میں نے غوطہ نہیں لگایا حالاں کہ وہ دوسری بار بھی دوسری بار نہیں تھی۔ اگر لوگوں کے کہنے میں آجاتی تو اس آخری بار حوصلہ دکھانے میں مجھے زخم ہی زخم ملتے۔ ڈیفنی نے اپنی زندگی میں ایک مرد کو آنے دیا، میں نے دوبار یہ غلطی کی۔ اب تم بتاؤ کیا پوچھنا چاہتی ہو؟ اَن گنت لے جاکر ڈبونے والوں سے میرا برقع میری حفاظت کرتا ہے۔ اب تم سمجھیں؟ دونوں مردوں سے تعلق کیا تھا؟ ان کا سہارا لینا، جو عورت کی سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے۔''

پھر سر جھکا کر کلیرس نے رونا شروع کیا اور روتے روتے جیور جیانا سے لپٹ گئی۔ اس کے بعد اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اس کی زندگی کی طرزِ فکر کو دھوکوں نے مرتب کیا تھا، دھوکوں ہی نے ڈیفنی اور ممتاز اور کلثوم کی زندگی کو شکل دی تھی۔

جب جیور جیانا کو اپنا کندھا اور سینہ بھیگا ہوا محسوس ہوا تو اس نے ماں کو بستر پر لٹا دیا۔ گلاس میں ٹھنڈا پانی بھر کر لائی، ماں کے چہرے کو پانی میں اپنے دوپٹے کا پلو ڈبو ڈبو کر پونچھا اور سر اوپر اٹھا کر ہونٹ تر کیے۔

آنکھیں کھول کر کلیرس دیر تک اپنی بیٹی کو دیکھتی رہی۔

جیور جیانا نے کہا، ''کہہ ڈالیے۔ یہ باتیں تو آپ کو بہت پہلے کہہ ڈالنی چاہیے تھیں۔''

کلیرس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نئی بوندیں ابھر آئیں۔ اس نے رک رک کر کہا، ''مجھے کیا حق تھا تمھارا چہچہانا روک دوں۔ سب پرندے تو جال میں نہیں پکڑے جاتے ہیں۔ نہ پکڑے جانے کے خوف سے اپنے گھونسلوں سے باہر نہیں نکلتے ہیں۔''

جیور جیانا نے کہا، ''اس کوفی پر تو جھلی آ گئی ہے۔ نئی بنا کر لاتی ہوں۔''

پھر جب دونوں برابر بیٹھی کوفی پی رہی تھیں جیور جیانا نے کہا، ''ٹھیک ہے، میں یہ بات

ختم کردوں گی۔ صمد کو میں جانتی ہوں، میرے انکار پر وہ تلملائے گا نہیں۔ نہ اپنا کولج بدلے گا، نہ کولج آنا بند کردے گا، زیادہ توجہ سے پڑھے گا۔

مما میں ایک بات اور آپ کو بتادوں، صمد کے ڈیفنس میں نہیں کہہ رہی ہوں، وہ مجھے سبز باغ نہیں دکھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے، سوری کہتا تھا' ہم مل کر اپنے لیے راہ پیدا کریں گے، باپ کی کمائی کے بل بوتے پر میں نہیں جیوں گا' کئی دفعہ وہ روٹھ بھی چکا ہے اور میں بھی کئی دفعہ اس سے روٹھ چکی ہوں، دونوں آسانی سے من جاتے ہیں۔''

کلیرس بیٹی کی باتیں پہلی بار دلچسپی اور مسرت سے سن رہی تھی۔ امید بھرے لہجے میں اس نے پوچھا،'' وہ تمھیں دھوکا تو نہیں دے گا؟''

جیور جیانا نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا،'' مگر مما صمد تو لڑکا ہے۔ وہ خود دھوکے میں آسکتا ہے۔''

کلیرس نے کہا،'' ایک بار پھر مجھے وہ تصویر دکھاؤ۔''

جیور جیانا کے سینے میں دُھکر پکر ہو رہی تھی جب وہ اپنی ایک کتاب میں سے وہ گروپ فوٹو نکال کر لائی اور اسے کلیرس کے ہاتھ میں تھما کر ماں سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

وہاں سے وہ کلیرس کے جذبات کو اس کے چہرے پر لکھا دیکھ سکتی تھی۔

کلیرس دیر تک لڑکے کو اس گروپ میں دیکھتی رہی۔

چند آدمیوں کا چھوٹا سا کنبہ تھا۔ سب نے ہنسی خوشی تصویر کھنچوائی تھی، جیسے کبھی ایک دوسرے سے علاحدہ ہونے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں کیوں کہ کوئی کسی سے کبیدہ خاطر نہیں تھا۔

ایک آنسو ٹپک کر تصویر پر گرا اور اس نے آنسوؤں کے پیچھے سے جیور جیانا کو دیکھتے ہوئے کہا،'' اس میں مارٹن، حمزہ، فتح کی شباہت نہیں، واقعی لڑکا ہے۔ تم دونوں ان جھمیلوں میں کہاں پڑ گئے...!''

☆☆☆

نظم ونثر کے نئے انداز

دنیا زاد

کتابی سلسلہ

سال میں تین کتابیں

خصوصی اشاعتیں

عاشق من الفلسطین

سیاسی سماجی تجزیہ اور نظم ونثر کا انتخاب

دنیا دنیا دہشت ہے

تجربے سے تجزیے تک

میں بغداد ہوں

موجودہ صورت حال کا ادبی تناظر

بی ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی

ای میل: info@scheherzade.com

حسن منظر

کی نئی کتابیں

ناول

العاصفہ

دھنی بخش کے بیٹے

افسانے

خاک کا رتبہ

رہائی

جان کے دشمن

(مختصر ناول)

اردو کے افسانوی ادب کی اہم تخلیقی شخصیت حسن منظر کا پورا نام سیّد منظر حسن ہے۔ وہ مارچ ۱۹۳۴ء میں ہاپڑ، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم مراد آباد میں حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ لاہور آئے جہاں فورمین کرسچین اور اسلامیہ کالج کے بعد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کیا۔

انہوں نے یونیورسٹی اوف ایڈمبرا اور راول کالجز آف فزیشنز اینڈ سرجنز سے اعلیٰ طبّی اسناد حاصل کیں۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ انگلستان، ملایا، نائیجیریا، سعودی عرب میں مقیم رہے اور متعدد ممالک کا سفر کیا جس کے متنوع تجربے کو انہوں نے اپنی تحریروں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔ حسن منظر اب حیدرآباد میں مقیم ہیں جہاں وہ سائیکٹرسٹ کے طور پر پریکٹس کرتے ہیں۔

حسن منظر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''رہائی'' ۱۹۸۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے پانچ مزید مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں تازہ ترین ''خاک کا رُتبہ'' ہے جسے ۲۰۰۷ء کی بہترین نثری کتاب کا مولوی عبدالحق قومی ایوارڈ دیا گیا۔

ان کے متفرق مضامین اور بچوں کے لیے کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ ان کے افسانوں کے انگریزی تراجم کراچی اور نئی دلّی سے شائع ہو چکے ہیں۔

حسن منظر کے ناول ''العاصفہ''، ''دھنی بخش کے بیٹے'' اور ''وبا'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان دنوں وہ ایک نئے ناول پر کام کر رہے ہیں۔

سرورق: شہرت یافتہ مصور رفاقت گوگی کی ایک تصویر سے

ISBN: 978-969-568-042-1

Pak Rs: 160/-